الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

نادان لوگ جس چیز کو بزدلی کہتے ہیں
دانش مند کی نظر میں وہ تدبیر ہوتی ہے

اکتوبر ۱۹۹۱ □ شمارہ ۱۷۹ □ ۵ روپیہ

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۹۱ ، شمارہ ۱۷۹

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353818, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

ترتیب

اونچی عمارتوں میں آٹومیٹک لفٹ لگی ہوتی ہے۔ آپ اس کے اندر داخل ہو کر بٹن دباتے ہیں اور وہ آپ کو آپ کی مطلوبہ منزل پر پہنچا دیتی ہے۔

فرض کیجئے کہ چار آدمی بیک وقت لفٹ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ آپ کو دوسری منزل پر جانا ہے، اور بقیہ لوگ دسویں اور گیارھویں منزل پر جانے والے ہیں، اب اگر دوسرے لوگ پہلے اپنے نمبر والا بٹن دبا دیں اور آپ اپنا نمبر بعد کو دبائیں تو ایسا نہیں ہوگا کہ اس بنا پر لفٹ پہلے اوپر چلی جائے اور بقیہ لوگوں کو دسویں اور گیارھویں منزل پر اتارے۔ اور اس کے بعد نیچے آکر آپ کو دوسری منزل پر پہنچائے۔ بٹن دبانے کی بے ترتیبی کے باوجود ایسا ہوگا کہ لفٹ پہلے دوسری منزل کے مسافر کو اس کی مطلوبہ منزل پر اتارے گی۔ اس کے بعد وہ اوپر کی منزلوں پر جائے گی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بٹن دبانے کی بے ترتیبی کو وہ از خود کس طرح با ترتیب بنا لیتی ہے۔ اس کا جواب کمپیوٹر ہے۔ جدید طرز کی لفٹ میں کمپیوٹر لگا ہوا ہوتا ہے، یہ کمپیوٹر ایک قسم کے مشینی دماغ کی مانند کام کرتا ہے۔ وہ بٹن دبانے کی بے ترتیبی کو منزل کی ترتیب میں بدل دیتا ہے اور لفٹ کو "حکم" دیتا ہے کہ منزل کی اصل ترتیب کے اعتبار سے مسافروں کو اوپر لے جائے۔

آٹومیٹک لفٹ خدا کی ایک ادنیٰ مخلوق ہے۔ جب خدا کی ایک ادنیٰ مخلوق میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مصنوعی ترتیب کو صحیح ترتیب کی صورت میں بدل دے تو یہ طاقت خود خالق کے اندر کتنی زیادہ ہوگی۔ بلاشبہ خالق کے اندر وہ صفت آخری کمال درجہ میں ہے جو آٹومیٹک لفٹ میں صرف معمولی ابتدائی درجہ میں پائی جاتی ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے۔ اس آزادی سے فائدہ اٹھا کر لوگوں نے اپنا نام مصنوعی ترتیب کے ساتھ لکھ لیا ہے، کوئی تیسرے درجہ کا آدمی ہے، مگر اس نے اپنا نام نمبر ایک پر لکھوا رکھا ہے، کوئی نچلی سطح پر بٹھائے جانے کے قابل ہے۔ مگر اس نے اپنے آپ کو اونچی سطح پر بٹھا رکھا ہے۔ کوئی ہے جو سرے سے ذکر کے قابل نہیں مگر وہ مصنوعی طور پر شہرت کے اسٹیج پر جگہ حاصل کیے ہوئے ہے۔ آخرت میں یہ تمام غلط ترتیب درست کر دی جائے گی۔ اس کے بعد ادنیٰ درجہ کا آدمی ادنیٰ سیٹ پر پہنچا دیا جائے گا اور اعلیٰ درجہ کا آدمی اعلیٰ سیٹ پر۔

موت کا فیصلہ

آئن فلیمنگ (Ian Fleming) ۱۹۰۸ میں لندن میں پیدا ہوا، ۱۹۶۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۲۹ سے ۱۹۳۳ تک وہ ماسکو میں جرنلسٹ کی حیثیت سے رہا۔ مارچ ۱۹۳۳ میں سوویت روس کی حکومت نے پانچ برطانی انجینیروں کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ماسکو میں ان کے اوپر مقدمہ چلایا گیا۔ یہ یورپی صحافت کے لیے انتہائی اہمیت کی خبر تھی۔ اس مقدمہ کی کارروائی لکھنے کے لیے یورپ کے جو اخباری نمائندے ماسکو پہونچے، ان میں رائٹر کا نمائندہ آئن فلیمنگ بھی تھا۔ آئن فلیمنگ چاہتا تھا کہ وہ اس فیصلہ کی خبر سب سے پہلے یورپ بھیجے۔

اس مقصد کے لیے اس نے ایک خاموش منصوبہ بنایا۔ جس دن ماسکو کے جج مقدمہ کا فیصلہ دینے والے تھے، اس نے پورے واقعہ کی دو الگ الگ رپورٹیں تیار کیں۔ ایک رپورٹ ملزمین کے سزایاب ہونے کی صورت میں۔ اور دوسری رپورٹ وہ جب کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔

مقررہ وقت پر جیسے ہی ججوں نے فیصلہ کے الفاظ کہے۔ آئن فلیمنگ نے فوراً اپنی رپورٹ کی خالی جگہ پُر کی اور اسی وقت ٹیلی گرام کے ذریعہ اس کو اپنے یورپی دفتر کے نام روانہ کر دیا۔ یہ مذکورہ مقدمہ کی پہلی خبر تھی جو لندن پہونچی۔ آئن فلیمنگ کو اس کے بعد رائٹر نے بڑی ترقی دیدی۔

آئن فلیمنگ کا زیادہ دولت کمانے کا شوق اس کو ناول نگاری کی طرف لے گیا۔ اس نے سنسنی خیز ناول نگاری میں زبردست شہرت حاصل کی۔ اس کے تیرہ ناول تقریباً دو کرور کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ اور گیارہ زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کا ایک ناول ڈاکٹر نو (Dr. No) ایک لاکھ ڈالر میں فروخت ہوا۔ یہ کہانی فلمائی گئی اور اس سے مزید اس کو ایک لاکھ ڈالر حاصل ہوئے۔ آئن فلیمنگ اب دولت اور شہرت کے آسمان پر تھا۔ مگر عین اس وقت اس کے اوپر وہ وقت آگیا جو ہر ایک کے اوپر آتا ہے۔ ابھی وہ صرف ۵۶ سال کی عمر کو پہونچا تھا کہ اچانک وہ ۱۲ اگست ۱۹۶۴ کو مر گیا۔

آئن فلیمنگ روسی جج کے فیصلہ کی پیشگی رپورٹ تیار کر سکتا تھا، مگر وہ موت کے جج کے فیصلہ کا پیشگی اندازہ نہ کر سکا۔ عین اس وقت اسے اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا پڑا جب کہ وہ سب سے زیادہ زندگی کا خواہش مند ہو چکا تھا۔

سادگی میں عظمت

ایک مرتبہ میں ایک قصبہ میں گیا۔ وہاں ایک مسجد میں چند بار نماز پڑھی۔ میں نے دیکھا کہ اس مسجد کے جو امام ہیں، وہ لوگوں کے درمیان نہایت محبوب ہیں۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ وہ جو بات کہہ دیں، اس کو تمام لوگ فوراً مان لیتے ہیں۔ میں نے مختلف لوگوں سے پوچھا کہ امام صاحب کی اس مقبولیت کا سبب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے کچھ سادہ اصولوں پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ اور یہی ان کی مقبولیت اور محبوبیت کا راز ہے۔

امام صاحب کا معمول تھا کہ وہ اذان سنتے ہی اپنے گھر سے نکل پڑتے تھے۔ مؤذن کے آخری کلمات کے ساتھ وہ مسجد میں داخل ہو جاتے۔ یہ گویا خدا کی پکار پر فی الفور دوڑ پڑنا ہے۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو کہ وہ خدا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑے تو لوگ بھی اس کی طرف دوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح امام صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے تھے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص سلام کرنے میں ان پر سبقت لے جائے۔ جو شخص اس طرح لوگوں کو سلام کرنے لگے، وہ گویا لوگوں کے حق میں اپنے جذبۂ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اور جس آدمی کے دل میں دوسروں کے لیے محبت ہو دوسرے لوگ بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

امام صاحب کی ایک اور صفت یہ تھی کہ وہ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی آمدنی کے بقدر نہایت سادگی اور قناعت کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ طریقہ بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ دوسروں سے سوال کرنے والا دوسروں سے چھوٹا بن جاتا ہے۔ اور جو شخص دوسروں سے سوال نہ کرے، وہ دوسروں کو اپنے سے بڑا دکھائی دینے لگے گا۔

امام صاحب کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ صرف بقدر ضرورت کلام کرتے تھے۔ وہ دوسروں کی بات زیادہ سنتے اور خود کم بولتے، اور جو کچھ بولتے، سوچ سمجھ کر بولتے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کم بولنا آدمی کو باوزن بناتا ہے اور زیادہ بولنا آدمی کو ہلکا کر دیتا ہے۔

یہ اصول سب کے سب نہایت سادہ اصول ہیں۔ وہ بظاہر بہت معمولی ہیں۔ مگر وہ جس انسان کے اندر پیدا ہو جائیں، اس کو وہ غیر معمولی انسان بنا دیتے ہیں۔

نظر انداز کرو

سر پرسی کاکس (Sir Percy Cox) ایک انگریز تھا۔ وہ ۱۸۶۴ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۷ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۱۸۸۴ سے ۱۸۹۰ تک برٹش فوجی افسر کی حیثیت سے انڈیا میں رہا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عراق برٹش مینڈیٹ کے تحت آگیا۔ اس کے بعد کاکس کو ۱۹۲۰ میں عراق بھیجا گیا۔ وہ وہاں برٹش ہائی کمشنر کی حیثیت سے ۱۹۲۳ تک مقیم رہا۔

سر پرسی کاکس کا قیام بغداد میں تھا۔ ایک روز صبح کو وہ اپنی رہائش گاہ میں تھا کہ صبح کے وقت قریب کی مسجد سے آواز سنائی دینے لگی۔ یہ موذن کی آواز تھی جو فجر کی اذان پکار رہا تھا۔ کاکس کے لیے یہ ایک نئی آواز تھی جو اس نے اب تک نہیں سنی تھی۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ یہ باغیوں کا کوئی گروہ تو نہیں ہے جو نعرہ لگا رہا ہے۔ اس نے اپنے آدمی کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ مسلمانوں کی اذان ہے۔ وہ روزانہ اپنی مسجد میں اسی طرح اذان پکارتے ہیں تاکہ لوگ اس کو سن کر مسجد میں نماز کے لیے آجائیں۔

سر پرسی کاکس نے سنجیدہ لہجہ میں پوچھا کہ اس سے ہمارے ایمپائر کو کوئی خطرہ تو نہیں۔ بتایا گیا کہ نہیں۔ اس نے جواب دیا: پھر انھیں چھوڑ دو، وہ جو کر رہے ہیں کرتے رہیں۔

میں کہوں گا کہ مسلمانوں کو یہی پالیسی سڑک کے نعروں کے بارہ میں اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے فرقہ کے لوگ جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں وہ "دل آزار نعرے" لگاتے ہیں۔ کوئی فرقہ پرست لیڈر پارک میں جلسہ کرکے "اشتعال انگیز" الفاظ بولتا ہے۔ اس سے مسلمان بھڑک کر کارروائی کرتے ہیں اور اس کے بعد فساد ہو جاتا ہے۔

ایسے مواقع پر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سوچیں کہ کیا یہ الفاظ ان کے لیے کوئی عملی خطرہ ہیں۔ کیا وہ انھیں کوئی جسمانی یا مادی نقصان پہونچا رہے ہیں۔ مسلمان جب اس طرح سوچیں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ اس قسم کے الفاظ ان کے لیے کوئی عملی خطرہ نہیں۔ یہ معلوم ہونے کے بعد انھیں چاہیے کہ سر کاکس کی طرح وہ کہہ دیں: پھر انھیں چھوڑ دو، وہ جو کچھ بولتے ہیں بولتے رہیں۔ ہم تو ان کو نظر انداز کرکے اپنا تعمیری کام جاری رکھیں گے۔

جوابی فارمولا

کہا جاتا ہے کہ ہندستان کے فرقہ پرست ہندو سازش کرکے مسلمانوں کے خلاف فساد کرتے ہیں۔ ان فسادات میں مسلمانوں کا بے حساب جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی "سازش" کیا ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو جان لیا ہے کہ ان کے اندر صبر کا مادہ نہیں۔ ان کے خلاف اشتعال انگیزی کی جائے تو وہ فوراً مشتعل ہو کر آمادۂ تشدد ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی اسی کمزوری کو استعمال کرنے کا نام فرقہ وارانہ فساد ہے۔

فرقہ پرست ہندو منصوبہ بنا کر ایک جلوس نکالیں گے۔ وہ جلوس سڑکوں سے گزرتا ہوا مسلم محلّے میں پہونچے گا۔ وہاں وہ مسجد کے سامنے باجا بجائے گا یا اشتعال انگیز نعرہ لگائے گا۔ اب مسلمان بھڑک کر جلوس کو روکیں گے۔ بات بڑھے گی۔ یہاں تک کہ عملی تشدد شروع ہو جائے گا۔ اب ہندوؤں کو موقع مل جائے گا۔ وہ مسلمانوں پر آغازِ تشدد کا الزام لگا کر ان کو جلانا اور مارنا شروع کر دیں گے۔ ان کی اس فسادی پالیسی کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ غصہ دلاؤ اور کامیابی حاصل کرو:

Anger and conquer

قرآن کے مطابق، اس فسادی پالیسی کا بہترین توڑ صبر و اعراض ہے۔ فساد کی مذکورہ سازش گویا ایک ٹائم بم ہے۔ اس بم کی تباہی سے بچنے کی آسان تدبیر یہ ہے کہ اس کو حکمت کے ساتھ ڈیفیوز کرکے ناکارہ بنا دیا جائے۔ فساد کے ٹائم بم کو ناکارہ بنانے کا قرآنی فارمولا ایک لفظ میں یہ ہے کہ اعراض کرو اور کامیابی حاصل کرو:

Avoid and conquer

اس فارمولے کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی اس قسم کا جلوس نکلے تو مسلمان نہ تو اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کریں اور نہ ان کے اشتعال انگیز نعروں پر مشتعل ہوں۔ اِن باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہیں۔ بار بار کا تجربہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے اس فارمولے پر عمل کیا وہاں فساد نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی اگر جلوس والوں نے کوئی حرکت کرنا چاہا تو پولیس نے اول مرحلہ میں اس کو سختی سے روک دیا۔ کیوں کہ اب مسئلہ پولیس بمقابلہ جلوس بن گیا تھا۔

تدبیر نہ کہ اشتعال

۲۰ فروری ۱۹۹۱ کو مئو کے عبدالجبار صاحب (۶۴ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہر فساد کا واحد حل حکیمانہ تدبیر ہے۔ اگر حکمت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو کبھی کوئی فساد نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربہ کے کئی واقعات بتائے۔

مئو کے محلہ مرزا ہادی پورہ میں عبدالحکیم گرہست صاحب رہتے ہیں۔ ان کے گھر کے پاس ایک مسجد ہے جو "جامع مسجد احناف" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۸۱ کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت کسی نے خنزیر کا مرا ہوا بچہ اس مسجد میں ڈال دیا۔ صبح کو فجر کی نماز کے لیے لوگ مسجد آئے تو دیکھا کہ وہاں خنزیر پڑا ہوا ہے۔ خبر مشہور ہوتے ہی سارے مئو میں سنسنی پھیل گئی۔ ۸ بجے تک عبدالحکیم گرہست کے مکان پر بھیڑ لگ گئی۔ مسلمان بڑی تعداد میں جمع ہو گیے۔ لوگ سخت مشتعل تھے۔ اور قریب تھا کہ کوئی کارروائی کر بیٹھیں اور پھر سارے شہر میں فساد کی صورت پیدا ہو جائے۔ مگر عبدالحکیم گرہست صاحب نے لوگوں کو سختی سے روکا اور پر امن رہنے کی تاکید کی۔

اس کے بعد انھوں نے پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ فوراً پولیس جائے واردات پر پہونچ گئی۔ پولیس والوں نے صدر دفتر اعظم گڈھ کو بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔ چنانچہ وہاں سے بھی افسران آگئے۔ پولیس افسروں نے آکر مسلمانوں کو سمجھایا اور کہا کہ آپ لوگ پر امن رہیں، ہم کو کارروائی کرنے کا موقع دیں۔ اس کے بعد پولیس والوں نے خنزیر کو وہاں سے اٹھوایا۔ اور فائر بریگیڈ کو بلا کر دور تک پانی سے اچھی طرح دھو دیا۔ اس کے بعد معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ کسی قسم کے فساد کی نوبت نہیں آئی۔ جب کہ اس طرح کے ایک واقعہ پر اکثر پورا شہر فساد کی زد میں آجاتا ہے۔

اس طرح کے مواقع پر بہترین عقل مندی یہ ہے کہ مسلمان امن پسندی کا ثبوت دیں۔ وہ خود کوئی جارحانہ کارروائی نہ کریں۔ بلکہ معاملہ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو یقینی ہے کہ کسی قسم کا فساد نہیں ہوگا۔ خنزیر ڈالنے والے اس لیے خنزیر ڈالتے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی جارحانہ کارروائی کر دیں تاکہ انھیں مکمل فساد کرنے کا موقع مل جائے۔ اس "سازش" کا توڑ یہ ہے کہ مسلمان بالکل خاموش رہیں اور پولیس کو اطلاع دینے کے سوا کوئی اور کارروائی نہ کریں۔ یہ فساد کے بم کو ناکارہ کر دینے کے ہم معنی ہوگا۔

غصّہ نہ دلاؤ

۲۹ مئی ۱۹۹۰ کو دہلی کے اخبارات میں ایک سبق آموز خبر تھی۔ سدرشن پارک (موتی نگر) کی جھگیوں میں ایک شخص رہتا ہے۔ اس کا نام اننت رام ہے۔ عمر ۳۵ سال ہے۔ وہ شراب کا عادی ہے۔ اس کے پاس شراب کے لیے پیسہ نہیں تھا، اس نے اپنی بیوی سے پیسہ مانگا۔ بیوی نے شراب کے لیے پیسہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر میاں اور بیوی میں تکرار ہوئی۔ اس کے بعد ٹائمس آف انڈیا (۲۹ مئی ۱۹۹۰) کے الفاظ میں، جو کچھ ہوا، وہ یہ تھا :

The accused, a habitual drunkard, was enraged when his wife refused to give him money he asked for. Giving way to his tantrums, he dashed his son against the floor, thus killing him then and there.

مجرم جو کہ شراب کا عادی ہے، اس وقت غصہ ہو گیا جب کہ اس کی بیوی نے اس کو وہ رقم نہ دی جو اس نے مانگی تھی۔ غصہ سے بے قابو ہو کر اس نے اپنے دو سال کے بچے (ارجن) کو لیا اور اس کو کئی بار اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹکا۔ اس کے نتیجہ میں اس کا بچہ اسی وقت مر گیا۔

جب آدمی غصہ میں ہو تو اس وقت وہ شیطان کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ اس وقت وہ کوئی بھی غیر انسانی حرکت کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنے بیٹے کو بے رحمانہ طور پر ہلاک کر سکتا ہے۔

یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو ہر آدمی کے اندر موجود ہے۔ ایسی حالت میں سماج کے اندر محفوظ اور کامیاب زندگی حاصل کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو غصہ دلانے سے بچے۔ وہ خوش تدبیری کے ذریعہ اس بات کی کوشش کرے کہ وہ دوسرے کو اس جذباتی حالت تک نہ پہونچنے دے جب کہ وہ شیطان کا معمول بن جائے اور اُس مجنونانہ کارروائی پر اتر آئے جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

غصہ اور انتقام کی برائی کا تعلق کسی قوم سے نہیں۔ وہ ہر انسان کے مزاج میں شامل ہے، خواہ وہ کسی بھی قوم یا کسی بھی ملک سے تعلق رکھتا ہو۔ غصہ اور انتقام کو انسانی مسئلہ کے طور پر لینا چاہیے نہ کہ فرقہ یا قوم کے مسئلہ کے طور پر۔

کاروباری استقلال

خوش حال طبقہ ناشتہ میں یا چائے کے ساتھ اناج کی بنی ہوئی ہلکی چیزیں لیناپسند کرتا ہے۔ اسی کی ایک صورت وہ ہلکی خوراک ہے جس کو کارن فلیک (cornflakes) کہا جاتا ہے۔ اس کی مختلف قسمیں بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔

بہت سی فرموں نے مختلف ناموں سے کارن فلیک بنائے۔ ان کے مزہ میں طرح طرح کا تنوع پیدا کیا۔ مگر ہندستانی مارکٹ میں وہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکے۔ حالاں کہ انھوں نے اشتہار پر کافی رقمیں خرچ کیں۔

اس وقت ہندستان کے بازار میں صرف دو فرموں کے بنائے ہوئے کارن فلیک زیادہ چل رہے ہیں۔ ایک، ہندستان ویجیٹیبلس آئلس کارپوریشن (HVOC) کا اور دوسرے موہن میکنس لمیٹڈ کا۔ یہ دونوں فرمیں سالانہ ایک ہزار ٹن کارن فلیک فروخت کرتی ہیں۔ جن کی قیمت تین کرور پچاس لاکھ ہوتی ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں فرمیں اشتہار پر سرے سے کوئی رقم خرچ نہیں کرتیں۔ ان کا تیار کیا ہوا کارن فلیک بغیر کسی اشتہار کے فروخت ہوتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۹ جون ۱۹۹۰)

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دوسری فرموں کی کوئی تاریخ نہیں۔ انھوں نے کسی نام سے کارن فلیک کی ایک قسم بنائی۔ وہ بازار میں نہیں چلی تو انھوں نے دوسری قسم بنا ڈالی یا سرے سے اس کو بنانے کا کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کر دیا۔ اس کے برعکس مذکورہ دونوں کامیاب فرموں کی صنعت کے پیچھے ۲۰ سال کی تاریخ ہے۔ وہ ۲۰ سال سے متواتر ایک ہی قسم کا کارن فلیک بنا رہی ہیں۔ ۲۰ سالہ تاریخ نے ان کو لوگوں کی نظر میں معلوم اور مسلّم بنا دیا ہے۔ کسی آدمی کو کارن فلیک لینا ہوتا ہے تو ان کے ذہن میں پہلے سے اس کا نام موجود ہوتا ہے اور وہ بازار جا کر اپنے اس معلوم کارن فلیک کو خرید لیتے ہیں۔

یہی کاروبار میں ترقی کا راز ہے۔ کاروبار میں استقلال کی حیثیت لازمی شرط کی ہے۔ آپ کاروبار کر کے اس کو چھوڑتے یا بدلتے رہیں تو آپ کبھی کاروبار میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ اور اگر آپ کاروبار کر کے اس پر جمے رہیں۔ کسی بھی دشواری کی وجہ سے اس کو نہ چھوڑیں تو "۲۰ سال" گزرنے کے بعد آپ لازماً کامیابی کی اگلی منزل پر پہونچ چکے ہوں گے۔

مطالعہ قرآن

قرآن میں یہود کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ ایک "نجات دہندہ" کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب وہ آئے گا تو ہم اس کا ساتھ دے کر مشرکوں سے لڑیں گے اور پھر دوبارہ اپنا غلبہ قائم کریں گے۔ مگر جب محمد بن عبداللہ کی صورت میں وہ آنے والا آیا تو یہود نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ آپ کے سخت ترین دشمن بن گیے (البقرہ رکوع ۱۱)

اس کی کیا وجہ ہے کہ جو لوگ ایک "آنے والے" کے منتظر رہتے ہیں، جب وہ آنے والا آتا ہے تو یہی لوگ اس کے سب سے بڑے دشمن بن جاتے ہیں۔ اس کا جواب قرآن کے مذکورہ حصہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

اس انکار اور دشمنی کا سبب ہوائے نفس (البقرہ ۸۷) ہے۔ یہ انتظار کرنے والے سمجھتے ہیں کہ آنے والا ان کی ہوائے نفس کے مطابق ہوگا۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ ان کی ہوائے نفس کی تائید نہیں کر رہا ہے تو پہچان لینے کے باوجود وہ اس کے منکر اور مخالف بن جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو بدلنے کے بجائے وہ خدا کے فیصلہ کو بدلنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

آنے والا بے آمیز حق کو لے کر آتا ہے، جب کہ وہ ملاوٹ والے حق کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا خدا کی بڑائی کو بیان کرتا ہے، جب کہ وہ اپنے اکابر کی بڑائی کو محبوب بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا اصولی دین کا اعلان کرتا ہے، جب کہ وہ قومی دین کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا آخرت کے مسائل کو سب کچھ بتاتا ہے، جب کہ وہ دنیا کے مسائل کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا زندہ دین کی طرف پکارتا ہے، جب کہ وہ جامد دین کی بنیاد پر گدیاں سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں۔ آنے والا اتباعِ حق کا داعی ہوتا ہے، جب کہ وہ اتباعِ ھوی پر اپنی زندگی کا نقشہ بنائے ہوتے ہیں۔

یہ فرق آنے والے کو ان کی نظر میں سخت مبغوض بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوتے، کیوں کہ اس میں انھیں اپنی پوری زندگی کا ڈھانچہ بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ آنے والے کو غلط ثابت کرنے کی جھوٹی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خود اپنے مطلوب کو نامطلوب بنا دیتے ہیں۔

ایک آزمائش

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) اس سے انسان کی ایک پیدائشی کمزوری معلوم ہوتی ہے۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ انسان بیک وقت دو چیزوں پر دھیان نہیں دے سکتا۔ آدمی صرف ایک چیز کو اپنا مرکز توجہ بنا سکتا ہے۔ جب بھی وہ ایک چیز پر فوکس کرے گا تو دوسری چیزیں لازمی طور پر اس کے لیے فوکس سے باہر (out of focus) ہو جائیں گی۔

انسان کی یہ صفت انسان کے لیے ایک بے حد نازک آزمائش ہے۔ اپنے حالات یا اپنے ذوق کے لحاظ سے وہ ایک چیز کو اختیار کرتا ہے۔ اس کے یک قلبی مزاج کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز اس کو ساری چیز نظر آنے لگتی ہے۔ بقیہ چیزیں، خارجی طور پر موجود ہوتے ہوئے بھی، اس کے اپنے علم میں غیر موجود ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی اس سوچ میں پختہ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی ایک چیز کو وہ سب سے اعلیٰ چیز سمجھ لیتا ہے جس پر ابتداءً اس نے اپنی نظروں کو جمایا تھا۔

یہ ایک نازک صورت حال ہے جس میں ہر انسان مبتلا ہے۔ اپنے فطری مزاج کی بنا پر چونکہ دوسری چیزیں آدمی کے فوکس میں نہیں ہوتیں اس لیے بقیہ چیزوں کی حیثیت اس کے نزدیک ایسی ہو جاتی ہے گویا کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ شاید ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

انسان کی اسی پیدائشی ساخت کی بنا پر اس کے اندر وہ کمزوری پیدا ہوتی ہے جس کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ شیطان نے لوگوں کے لیے ان کے کاموں کو ان کی نظر میں خوب صورت بنا دیا ہے (النحل ۶۳) اسی طرح فرمایا کہ لوگ ناپسندیدہ کام میں مشغول ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں (الکہف ۱۰۴) دوسری جگہ فرمایا کہ لوگ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور پھر بطور خود اس کے کسی جزء کو لے کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ اصل دین کو پکڑے ہوئے ہیں (الروم ۳۲)

کسی انسان کے ساتھ اس قسم کی تباہ کن صورت حال کیوں پیش آتی ہے۔ اس کا سبب اس کی یہی مزاجی کیفیت ہے۔ وہ جب ایک بار کسی چیز کو اپنا لیتا ہے تو اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ اس ایک چیز کے علاوہ دوسری تمام چیزیں اپنے آپ اس کے لیے اوجھل (آؤٹ آف فوکس) ہو جاتی ہیں۔ وہ موجود ہوتے ہوئے بھی اس کے اپنے لیے ایسی بن جاتی ہیں گویا کہ وہ موجود ہی نہ ہوں۔

اب آدمی کی ساری دل چسپی اس کی اپنی اختیار کردہ چیز سے ہو جاتی ہے۔ اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر وہ اس فرضی یقین میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ معاملہ کا سرا پکڑے ہوئے ہے۔ حالانکہ اس کے ہاتھ میں صرف ایک بے حقیقت تنکا ہوتا ہے جو طوفان کے پہلے ہی جھٹکے میں اس سے جدا ہو جائے۔

اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے کہ ہر انسان اپنے شاکلہ پر عمل کرتا ہے، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون شخص زیادہ صحیح راستہ پر ہے (الاسراء ۸۴) اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے ذاتی شاکلہ میں اپنے آپ کو پوری طرح برسرِ حق سمجھے مگر وہ اللہ کے نزدیک برسرِ حق نہ ہو۔ ایسے لوگ آخرت میں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے۔

انسان کی یہ پیدائشی کمزوری جس طرح عام انسانوں کے لیے فتنہ ہے اسی طرح وہ امت مسلمہ کے افراد کے لیے بھی فتنہ ہے۔ امت مسلمہ کا معاملہ اس عام آزمائش سے مستثنیٰ نہیں۔ مسلمانوں کے درمیان بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ دین کے ایک پہلو کو لے کر اس کو اپنا مرکز توجہ بنالیں، اور پھر دین کے دوسرے تمام تقاضے ان کے فوکس سے باہر نکل جائیں۔ ایسے لوگوں کا سارا دھیان بس ایک چیز پر جم کر رہ جائے گا۔

قرآن وحدیث کے معیار کے مطابق، وہ ایک خود ساختہ دین پر ہوں گے۔ مگر اپنے ذاتی ذہن کے اعتبار سے وہ یہی خیال کریں گے کہ وہ کامل حق پر ہیں، کیونکہ ان کا ذہن انھیں بتا رہا ہو گا کہ انھوں نے دین کے سب سے اہم حصہ کو پکڑ رکھا ہے۔

یہ ایک انتہائی نازک آزمائش ہے جس میں ہر شخص مبتلا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کے الفاظ ہر ایک کو یہ چیتاونی دے رہے ہیں کہ ——— کہو کیا میں تم کو آگاہ کردوں کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں۔ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہو گئی۔ اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں (الکہف)

اس امتحان سے بچنے کا واحد ذریعہ احتساب خویش ہے۔ یعنی اپنے مزاج کو کسوٹی نہ سمجھنا بلکہ قرآن وسنت کو دین کی کسوٹی قرار دے کر اپنے آپ کو اس پر جانچتے رہنا۔ جو آدمی اس طرح اپنا بے رحمانہ احتساب نہ کرے وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں مبتلا کر رہا ہے کہ آخرت میں اس پر کھلے کہ وہ محض ایک خود ساختہ دین پر تھا، اگرچہ نادانی کی بنا پر وہ اپنے آپ کو خدا کے مطلوب دین پر سمجھتا رہا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف

مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷ - ۱۸۷۹) سیاسی مسلک کے اعتبار سے انڈین نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) کا مسلک اس معاملہ میں مختلف تھا۔ وہ کانگریس کی حمایت کو مسلمانوں کے لیے درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس اختلاف کے باوجود دونوں بزرگوں میں نہایت اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

ایک شخص کا ذہنی سانچہ اگر یہ ہو کہ موقف صرف دو ہوا کرتے ہیں۔ یا کامل موافقت یا کامل مخالفت، تو وہ دونوں بزرگوں کے اس طریقہ کو "زمانہ شناسی" پر محمول کرے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان اگرچہ ایک دوسرے کے مخالف تھے، مگر ذاتی مفاد کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بارے میں اچھے الفاظ بولتے رہے۔

مگر جو شخص اسلام کی روح اور مومنانہ مزاج کو جانتا ہو وہ اس کو وسعت نظری قرار دے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان مخلص تھے۔ دونوں کا دین ایک تھا۔ البتہ بعض مسائل میں دونوں کی رائے ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھی۔ اور اس قسم کا اختلاف انسانوں کے درمیان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ہر دور کے مومنین صالحین میں اس قسم کا اختلاف پایا جاتا تھا اور ہمیشہ پایا جاتا رہے گا۔ یہ اختلاف بذات خود کوئی غیر محمود چیز نہیں۔ وہ غیر محمود صرف اس وقت بنتا ہے جب کہ اختلاف صرف اختلاف نہ رہے، وہ نفرت اور عناد تک جا پہونچے۔

اصحاب رسول ؐ کے درمیان بہت سے امور میں اختلاف تھا۔ اسی طرح فقہاء اور علماء میں اور مفسرین قرآن اور شارحین حدیث میں ہزاروں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اختلافات کا برملا اظہار کیا۔ اس کے باوجود ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک دوسرے کا اعتراف کیا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی قدر دانی کرتے رہے۔ اس دو طرفہ عمل کا سبب زمانہ شناسی نہیں تھی بلکہ دین شناسی تھی۔ ان کا یہ مسلک مفادِ دنیا کی بنا پر نہ تھا بلکہ خوف آخرت کی بنا پر تھا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف ایک آدمی کے مومنِ خاشع ہونے کی علامت ہے۔ لیکن بے خبر لوگوں کے لیے وہ مفاد پرستی اور زمانہ شناسی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

دو طریقے

تحریکیں، خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، وہ ہمیشہ دو طریقے پر عمل کرتی ہیں۔ ایک تنظیم کی صورت میں، اور دوسرے اشاعتِ افکار کی صورت میں۔ اول الذکر تحریک کی مثال، موجودہ زمانہ میں، الاخوان المسلمون اور انڈین نیشنل کانگریس ہے۔ یہ دونوں تحریکیں تنظیم کی صورت میں ظہور میں آئیں اور تنظیمی انداز میں آگے بڑھیں۔

دوسرے انداز کی تحریکوں کی مثال اس سے بھی زیادہ عام ہے۔ اور وہ قدیم اور جدید دونوں زمانوں میں پائی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کی ایک مثال حضرت مسیح علیہ السلام کی دینی تحریک ہے۔ یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ کوئی تنظیم قائم کی۔ وہ صرف اپنی تعلیم کی اشاعت میں مشغول رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا "رفع" فرمالیا۔ مگر آپ کے بعد آپ کے شاگرد اور متاثرین اٹھے۔ انھوں نے آپ کے مشن کو (اگرچہ محرف صورت میں) اتنے بڑے پیمانہ پر پھیلایا کہ آج حضرت مسیح کے ماننے والوں کی تعداد تمام مذاہب میں سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح جدید یورپ میں ڈیموکریسی اور کمیونزم کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے ابتدائی علم برداروں نے کبھی کوئی تنظیم نہیں بنائی۔ وہ صرف اپنے نظریہ کے حق میں لٹریچر تیار کر کے مر گئے۔ مگر ان کے بعد ان کے ہم خیال افراد نے ان تحریکوں کو اتنے بڑے پیمانہ پر پھیلایا کہ یہی تحریکیں عملاً ساری دنیا پر چھا گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریکوں کی اصل طاقت ان کے افکار ہیں۔ تحریکیں اپنے افکار کے زور پر اٹھتی ہیں اور اپنے افکار کے زور پر پھیلتی ہیں۔ کسی تحریک کا محرک اول اگر اپنا کوئی تنظیمی ڈھانچہ نہ بنا سکے، وہ اپنے افکار کی تخلیق میں بیج کی مانند بظاہر فنا ہو جائے تب بھی اگر اس کے افکار میں طاقت ہے تو وہ درخت کی مانند ابھرے گا اور آندھی اور طوفان کی طرح دنیا میں پھیل جائے گا۔

کسی تحریک کے مستقبل کے لیے اصل اہمیت کی چیز کوئی خارجی ڈھانچہ نہیں بلکہ اس کی اپنی فکری طاقت ہے۔ اگر تحریک کے فکر میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسانوں کے ذہن میں انقلاب پیدا کر دے، وہ لوگوں کی ذہنی صلاحیت کو ابھار کر انھیں تخلیقی انسان بنا دے تو یہی واقعہ اس بات کی ضمانت ہے کہ تحریک ہر موڑ کا مقابلہ کرتے ہوئے زندہ رہے گی۔ ایسی تحریک وہ افراد پیدا کرتی ہے جو خود اپنی ذات میں جماعت ہوں، جو خود پروگراموں کی تخلیق کریں۔ پھر کون ہے جو ایسی تحریک کا راستہ روک سکے۔

تحقیق ضروری

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَتْ اِمْرَأَةٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ عِنْدَہٗ، فَقَالَتْ زَوْجِیْ صَفْوَانُ بْنُ الْمُعَطَّلِ یَضْرِبُنِیْ اِذَا صَلَّیْتُ، وَیُفَطِّرُنِیْ اِذَا صُمْتُ، قَالَ وَصَفْوَانُ عِنْدَہٗ، قَالَ فَسَأَلَہٗ عَمَّا قَالَتْ، فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمَّا قَوْلُھَا "یَضْرِبُنِیْ اِذَا صَلَّیْتُ" فَاِنَّھَا تَقْرَأُ بِسُوْرَتَیْنِ وَقَدْ نَھَیْتُھَا، قَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَتْ سُوْرَۃٌ وَاحِدَۃٌ لَکَفَتِ النَّاسَ، قَالَ وَاَمَّا قَوْلُھَا "یُفَطِّرُنِیْ اِذَا صُمْتُ" فَاِنَّھَا تَنْطَلِقُ تَصُوْمُ وَاَنَا رَجُلٌ شَابٌّ فَلَا اَصْبِرُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَصُوْمُ امْرَأَۃٌ اِلَّا بِاِذْنِ زَوْجِھَا۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک صفوان بن معطل ہیں۔ اس درمیان ایک عورت آتی ہے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہتی ہے کہ صفوان بن معطل میرے شوہر ہیں۔ جب میں نماز پڑھتی ہوں تو وہ مجھ کو مارتے ہیں اور جب میں روزہ رکھتی ہوں تو میرا روزہ کھلوا دیتے ہیں۔

عورت کے اس بیان کے مطابق، بظاہر عورت صحیح تھی اور اس کا شوہر غلط، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شوہر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ صفوان بن معطل چوں کہ مجلس میں موجود تھے، آپ نے عورت کی شکایت کے بارہ میں ان سے دریافت کیا۔

انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، نماز کے لیے مارنے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دو دو سورتیں پڑھتی ہے، حالاں کہ اس سے میں اس کو منع کر چکا ہوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ہی سورہ کافی ہے۔ پھر صفوان نے کہا کہ، روزہ کھلوانے کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلسل روزہ رکھتی ہے اور میں جوان آدمی ہوں، صبر نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے درست نہیں کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر (نفل) روزہ رکھے۔

کسی کے خلاف شکایت کی بات معلوم ہو تو صرف سن کر اس کو نہیں مان لینا چاہیے۔ بلکہ تحقیق کرنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ تحقیق کے بعد شکایت غلط ثابت ہو۔

غلط استدلال

امام البخاری نے اپنی "صحیح" میں کتاب الدعوات (باب اذا بات طاہراً) میں البراء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ تم سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو کس طرح سوؤ اور اس وقت کون سی دعا پڑھو۔ یہ ایک لمبی روایت ہے۔ اس کا آخری حصہ یہ ہے:

آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ۔ فَإِنْ مُتَّ مُتَّ عَلَى الْفِطْرَةِ۔ وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَقُولُ۔ فَقُلْتُ أَسْتَذْكِرُهُنَّ: وَبِرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ۔ قَالَ لَا۔ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ۔

میں تیری کتاب پر ایمان لایا جو تو نے اتاری اور تیرے نبی پر جس کو تو نے بھیجا۔ اس کے بعد اگر تم مر گیے تو تم فطرت پر مروگے۔ اور تم اس قول کو آخری قول بناؤ۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر میں نے یاد کرتے ہوئے دہرایا: وَبِرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ۔ آپ نے کہا کہ نہیں۔ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ

اس واقعہ کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حدیث بالمعنی کی روایت جائز نہیں (لا یجوز روایۃ الحدیث بالمعنی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو دعا سکھائی تھی اس میں بِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ کا لفظ تھا۔ صحابی نے اس کو دہرایا تو ان کی زبان سے بِرَسُولِكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ نکل گیا۔ دونوں کا مطلب ایک تھا مگر لفظ میں فرق ہو گیا تھا۔ آپ نے اس لفظی فرق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ خود اپنے کہے ہوئے لفظ ہی کو دہرانے کی تاکید فرمائی۔ اس سے یہ نکلا کہ روایت بالمعنی کا طریقہ صحیح نہیں، بلکہ لفظ کی تبدیلی کے بغیر بعینہٖ روایت کرنا ضروری ہے۔

اگر اس دلیل کو مان لیا جائے تو احادیث کا بیشتر ذخیرہ قابل رد ٹھہرے گا۔ کیوں کہ بیشتر حدیثوں کی حیثیت روایت بالمعنی ہی کی ہے۔ مگر یہ استدلال بذات خود درست نہیں۔ یہ حدیث کو اس کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اس کا ایک غلط مفہوم بیان کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں ہے کہ روایت بالمعنی صحیح ہے یا روایت باللفظ۔ اس کا تعلق تمام تر ایک ادبی مسئلہ سے ہے۔ برسولک الذی ارسلت میں لفظی تکرار کی وجہ سے ایک ادبی نقص پیدا ہو رہا تھا۔ اس لیے آپ نے بنبیک الذی ارسلت کہنے کے لیے فرمایا جو ادبی اعتبار سے زیادہ بہتر ہے —— اس دنیا میں خدا اور رسول کے کلام کو بھی غلط مفہوم دیا جا سکتا ہے۔ پھر ایک انسان کے کلام سے غلط مفہوم نکالنا کیوں کر ممکن نہ ہوگا۔

فطرت کا تقاضا

تجرّد (غیر شادی شدہ زندگی) کو بعض مذاہب میں تقدس کا درجہ دیا گیا ہے۔ مگر جب بھی تجرّد کو عمل میں لایا گیا، معاشرہ میں ناقابل حل خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً قدیم یونان میں تجرد (celibacy) پر عمل کرنے کا انجام یہ ہوا کہ ان کی آبادی میں غیر معمولی کمی آگئی (14/815) اسی طرح مسیحی چرچ میں تجرد کو اعلیٰ معیار قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ اس بدتر صورت میں ظاہر ہوا کہ اہل کلیسا میں غیر منکوحہ تعلقات اور ناجائز اولاد کے مسائل پیدا ہو گیے (3/1043)

یہ فطرت سے انحراف کی سزا ہے۔ جب بھی انسان کے کسی فطری تقاضے پر پابندی لگائی جائے گی، یہ پابندی شدید تر برائیاں پیدا کرے گی۔ جو تقاضا تخلیقی طور پر انسان کی فطرت میں شامل ہو، اس پر روک لگانا ممکن نہیں۔ ایسے کسی تقاضے پر روک لگانا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ مزید ایسی سنگین خرابیاں پیدا ہو جائیں جن پر کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو۔

اسی قسم کی غیر فطری پابندی کی ایک مثال لوگوں کو تنقید سے روکنا ہے۔ تنقید دوسرے فطری تقاضوں کی طرح ایک فطری تقاضا ہے۔ اگر اس پر روک لگائی جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ لوگوں کے دلوں میں تو کچھ ہوگا مگر وہ زبان سے کچھ اور بیان کریں گے۔ اس طرح لوگوں کے اندر منافقت کی برائی پیدا ہو جائے گی۔ اور منافقت تمام برائیوں میں سب سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ لوگوں کی سوچ میں فرق ہوتا ہے۔ اس بنا پر لوگوں کی رایوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی اختلافِ فکر کے اظہار کا نام تنقید ہے۔ تنقید اختلافِ رائے کی بنا پر ظہور میں آتی ہے اور اختلافِ رائے فطرت کے لازمی تقاضے کی بنا پر۔

تنقید پر روک لگانے سے تنقید کا اصل سبب تو ختم نہ ہوگا۔ البتہ اس کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ منافق بن جائیں گے۔ لوگوں کے دلوں میں تنقید ہوگی اور زبان پر تعریف۔ وہ بناوٹی باتیں کریں گے۔ ان کے قول اور ان کے احساس میں مطابقت باقی نہ رہے گی۔ اسی دو عملی کا نام منافقت ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ تنقید کو برداشت کرنے کا مزاج پیدا کیا جائے نہ کہ خود تنقید پر روک لگائی جائے۔ تنقید کو برداشت کرنے سے صحت مند معاشرہ بنتا ہے اور تنقید کو بند کرنے سے منافق معاشرہ۔

مجازی اسلوب

اقبال کہتے ہیں کہ قضا و قدر (خدا) نے مجھ سے کہا کہ کیا ہماری دنیا تمہارے لیے ساز گار ہے۔ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ کہا کہ پھر اس کو توڑ دو:

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد　　گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اسی طرح اقبال کا ایک شعر ہے:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے　　جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

بظاہر ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اقبال اور خدا کے درمیان گفتگو ہوئی۔ یا جبریل فرشتہ نے براہ راست اقبال سے کلام کیا۔ مگر جو آدمی ان اشعار کو اس طرح بالکل لفظی معنی میں لینے لگے اس کو اقبال کا جواب ہوگا کہ: شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔

یہ اشعار اور اس طرح کے بے شمار منثور اور منظوم کلام مجازی اسلوب میں ہیں نہ کہ حقیقی اسلوب میں۔ یہ اپنے ایک احساس کو واقعہ کی زبان میں بیان کرنا ہے، یہ اپنی ایک داخلی واردات کو اس طرح ظاہر کرنا ہے گویا کہ وہ خارجی دنیا میں پیش آئی تھی۔

یہ ایک معروف اسلوب ہے اور وہ اس لیے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ ایک طرف متکلم کے یقین کا اظہار ہو، اور دوسری طرف اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب پر زیادہ سے زیادہ اثر ڈالا جا سکے۔ مولانا روم کی پوری مثنوی اسی اسلوب میں ہے۔ بزرگانِ دین کا بیشتر کلام اس اسلوب سے بھرا ہوا ہے۔ ماضی اور حال کے تمام اکابر کے یہاں اس اسلوب کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

مثلاً ایک کہنے والا اگر یہ کہے کہ "میں نے خدا کو دیکھا۔ میں نے خدا کو چھوا"، تو وہ شخص بڑا نادان ہوگا جو ان الفاظ کو بالکل حقیقی معنیٰ میں لے کر اس پر فتویٰ صادر کرنے لگے۔

اس قسم کا ہر کلام مجازی اسلوب کلام ہے۔ یہ دراصل انسانی زبان میں اپنے یقین کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے خدا کے بارہ میں اس یقین کا تجربہ ہوا جو کسی چیز کو دیکھنے سے ہوتا ہے۔ کسی چیز کو چھونے سے اس کی موجودگی کا جو احساس ہوتا ہے اسی طرح میں نے خدا کی موجودگی کا احساس کیا۔ بالفاظ دیگر —— گویا کہ میں نے خدا کو دیکھا، گویا کہ میں نے خدا کو چھوا۔ گویا کہ میں نے خدا کو موجود پایا۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

صلح حدیبیہ (۶ھ) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر مخالفین اسلام نے صلح کی جو شرطیں پیش کیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بحث کے بغیر منظور کر لیا۔ یہ شرطیں سب کی سب مخالفینِ اسلام کے حق میں تھیں۔ چنانچہ جو مسلمان آپ کے ساتھ تھے ان کی اکثریت پر یہ صلح بے حد شاق گزری۔ حتی کہ بعض صحابہ یہ کہہ پڑے کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اور کیا فریق ثانی باطل پر نہیں ہے۔ اگر ہم حق پر ہیں اور فریق ثانی باطل پر ہے تو ہم اس قسم کی ذلت آمیز شرائط پر صلح کیوں کریں۔

پیغمبر اسلامؐ اور عام مسلمانوں کے درمیان رائے کا یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مسئلہ کو یک طرفہ طور پر دیکھ رہے تھے اور عام مسلمان دو طرفہ طور پر۔ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ کچھ ہم جھکیں اور کچھ وہ جھکیں۔ کچھ شرطیں ہماری مانی جائیں، کچھ شرطیں ان کی مانی جائیں۔ یعنی معاملہ کو دو طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ جب کہ پیغمبر اسلامؐ کا خیال تھا کہ ہم اس بحث کو نہ چھیڑیں کہ اس معاملہ میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ اس بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم یک طرفہ طور پر فریق ثانی کی پیش کی ہوئی شرطوں پر راضی ہو جائیں۔

مسلمانوں کی رائے خالص منطقی اعتبار سے بالکل درست تھی۔ نظری انصاف کے اعتبار سے یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا کہ دونوں میں سے کوئی فریق ضد نہ کرے، بلکہ اصولی بنیاد پر جو بات صحیح ہے اس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاملہ کو عملی نقطہ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر اصول اور منطق کی بنیاد پر اصرار کیا گیا تو فریق ثانی ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے عملی اعتبار سے مسئلہ کا ممکن حل صرف یہ ہے کہ فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں فریقوں میں ٹکراؤ کی صورت حال ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کے لیے کام کے مواقع نکل آئیں گے۔ دو طرفہ بنیاد پر اصرار عملاً دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کو برقرار رکھنے کے ہم معنی تھا۔ جب کہ یک طرفہ بنیاد پر راضی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی ٹکراؤ ختم

ہو، اور میدانِ جنگ سے باہر جو ممکن دائرہ ہے، اس میں مسلمانوں کے لیے دعوت اور تعمیر کی جدوجہد کی راہیں کھل جائیں۔

دور نبوت کا یہ واقعہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے رہنما واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آج جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں وہ انتہائی پیچیدہ ہیں۔ پچھلے پچاس سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسئلہ کا منطقی تجزیہ کرنا یا فریقِ ثانی کے سامنے اصولی مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا موجودہ حالات میں اتنا زیادہ بے فائدہ ہے کہ اس کی قیمت کاغذ کے اس ٹکڑے کے بقدر بھی نہیں ہے جس پر یہ منطق اور اصولی مطالبات لکھے جاتے ہیں۔ اصولی مطالبہ صرف اس وقت بامعنی ہوتا ہے جب کہ فریق ثانی اصول کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہو۔ اور موجودہ صورت حال میں اس کا کوئی ادنیٰ امکان بھی نہیں۔

مسلمان اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو دوطرفہ بنیاد پر طے کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ مسئلہ کا واحد قابل عمل حل صرف یہ ہے کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ اس وقت مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں نے فرصتِ عمل کو کھو دیا ہے۔ ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لیے کوئی تعمیری منصوبہ بنائیں اور اس کی طرف اپنا سفر شروع کریں۔ اگر مسلمان اس قربانی پر راضی ہو جائیں کہ وہ فریقِ ثانی سے اپنے تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تو اس کا نقد فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان فوراً ہی اپنے لیے عمل کا موقع پالیں گے۔ جس کو وہ تقریباً نصف صدی سے کھوئے ہوئے ہیں۔ عمل کا موقع پانا گویا سفر کے آغاز کو پانا ہے۔ اور جو لوگ اپنے سفر کے آغاز کو پالیں وہ یقیناً ایک روز اپنے سفر کے اختتام کو پہونچ کر رہتے ہیں۔

یہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں جو نقصان کو برداشت کرے وہی فائدہ کو حاصل کرتا ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنا اسی اصول کی تعمیل ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنے پر راضی ہونا بلاشبہ اپنے اندر نقصانات کے پہلو رکھتا ہے مگر موجودہ دنیا میں کسی بھی قسم کی ترقی کا یہی واحد زینہ ہے۔ موجودہ دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ صرف فائدہ چاہیں ان کے حصہ میں آخر کار صرف نقصان آئے۔ اور جو لوگ ابتدائی نقصان کو برداشت کریں وہ بالآخر ہر قسم کے فائدوں کے مالک بنیں۔

سیاست، دعوت

پاکستان کی ایک خاتون بیگم شائستہ اکرام اللہ (۷۵ سال) کا مضمون انگریزی ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ کے شمارہ مئی ۱۹۹۱ میں چھپا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک سرگرم کارکن تھیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ تک وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبر رہیں۔ ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۷ تک وہ مراکو میں پاکستان کی سفیر تھیں۔ مذکورہ مضمون کا عنوان ہے: "محمد علی جناح" اس مضمون میں انھوں نے مسٹر محمد علی جناح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ بٹوارہ سے پہلے ۱۹۴۵ میں پیش آیا۔ وہ لکھتی ہیں:

I'd been invited by the government to represent India at an international peace conference in San Francisco, but the leader of our political party was telling me I shouldn't go. His reason: our party, the All-India Muslim League, was committed to non-cooperation with India's British rulers; as a disciplined Leaguer, I could not be part of a government delegation. I was tempted to go, so I said, "Can't I go and not talk politics?" "Then what will you talk about?" Mohammed Ali Jinnah asked sharply. "The man in the moon?" His face softened. "I know how disappointed you are," he said, "but a principle is at stake. One day, I promise, you will go to an international conference — and with honour, representing your country." That encounter took place in 1945, but even today the wonder of it moves me.

Reader's Digest. New Delhi, May 1991, pp. 29-30

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے مجھے یہ دعوت دی گئی تھی کہ میں سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بین اقوامی امن کانفرنس میں ہندستان کی نمائندگی کروں۔ مگر ہماری سیاسی پارٹی کے قائد نے مجھ سے کہا کہ مجھ کو اس کانفرنس میں نہیں جانا چاہئے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری پارٹی، آل انڈیا مسلم لیگ، اس کی پابند ہے کہ وہ ہندستان کے برٹش حکمرانوں سے تعاون نہیں کرے گی۔ لیگ کی ایک باضابطہ فرد کی حیثیت سے مجھ کو ایک سرکاری وفد کا حصہ نہیں بننا چاہئے۔ میں اس کانفرنس میں جانے کی طرف راغب تھی۔ اس لئے میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں مگر وہاں میں سیاست کی بات نہ کروں۔ محمد علی جناح نے تیزی سے پوچھا کہ پھر اور کون سی بات تم وہاں کروگی۔ کیا چاند پر انسان کے بارہ میں۔ اس کے بعد انھوں نے نرمی کے ساتھ کہا کہ میں

سیاست، دعوت

پاکستان کی ایک خاتون بیگم شائستہ اکرام اللہ (۷۵ سال) کا مضمون انگریزی ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ کے شمارہ مئی ۱۹۹۱ میں چھپا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک سرگرم کارکن تھیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ تک وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبر رہیں۔ ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۷ تک وہ مراکو میں پاکستان کی سفیر تھیں۔ مذکورہ مضمون کا عنوان ہے: "محمد علی جناح"۔ اس مضمون میں انھوں نے مسٹر محمد علی جناح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ بٹوارہ سے پہلے ۱۹۴۵ میں پیش آیا۔ وہ لکھتی ہیں:

I'd been invited by the government to represent India at an international peace conference in San Francisco, but the leader of our political party was telling me I shouldn't go. His reason: our party, the All-India Muslim League, was committed to non-cooperation with India's British rulers; as a disciplined Leaguer, I could not be part of a government delegation. I was tempted to go, so I said, "Can't I go and not talk politics?" "Then what will you talk about?" Mohammed Ali Jinnah asked sharply. "The man in the moon?" His face softened. "I know how disappointed you are," he said, "but a principle is at stake. One day, I promise, you will go to an international conference — and with honour, representing your country." That encounter took place in 1945, but even today the wonder of it moves me.

Reader's Digest. New Delhi, May 1991, pp. 29-30

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے مجھے یہ دعوت دی گئی تھی کہ میں سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بین اقوامی امن کانفرنس میں ہندستان کی نمائندگی کروں۔ مگر ہماری سیاسی پارٹی کے قائد نے مجھ سے کہا کہ مجھ کو اس کانفرنس میں نہیں جانا چاہئے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری پارٹی، آل انڈیا مسلم لیگ، اس کی پابند ہے کہ وہ ہندستان کے برٹش حکمرانوں سے تعاون نہیں کرے گی۔ لیگ کی ایک باضابطہ فرد کی حیثیت سے مجھ کو ایک سرکاری وفد کا حصہ نہیں بننا چاہئے۔ میں اس کانفرنس میں جانے کی طرف راغب تھی۔ اس لئے میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں مگر وہاں میں سیاست کی بات نہ کروں۔ محمد علی جناح نے تیزی سے پوچھا کہ پھر اور کون سی بات تم وہاں کروگی۔ کیا چاند پر انسان کے بارہ میں۔ اس کے بعد انھوں نے نرمی کے ساتھ کہا کہ میں

جانتا ہوں کہ اس سے تم کو کتنی زیادہ مایوسی ہوگی۔ مگر یہاں ایک اصول خطرہ میں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تم ایک بین اقوامی کانفرنس میں جاؤگی اور عزت و وقار کے ساتھ اپنے ملک کی نمائندگی کروگی۔ مسٹر جناح کے ساتھ میرا یہ سامنا ۱۹۴۵ میں ہوا تھا، مگر آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرے اوپر اس کا عجیب تاثر ہوتا ہے۔

مذکورہ بین اقوامی کانفرنس امن کے موضوع پر ہو رہی تھی۔ یہاں موقع تھا کہ عالمی شخصیتوں کے سامنے اسلام کی امن سے متعلق تعلیمات پیش کی جائیں۔ اس عالمی اسٹیج کو اسلام کے تعمیری پیغام کے اعلان کے لئے استعمال کیا جائے۔ مگر مسٹر محمد علی جناح کے ذہن پر سیاست کا اتنا غلبہ تھا کہ انھیں اس کے سوا کوئی اور قابل ذکر بات معلوم ہی نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عالمی کانفرنس میں اگر سیاست کی بات نہ کہنا ہو تو پھر اور کون سی بات ہے جو وہاں کہی جائے گی۔

تاہم یہ صرف مسٹر جناح کا معاملہ نہیں، یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین کا معاملہ ہے۔ موجودہ زمانہ کے ہر مسلم قائد کا یہ حال ہوا کہ وہ سیاسی محرک کے تحت اٹھا۔ اس کی پوری سوچ سیاسی رخ پر چل رہی تھی۔ اس لئے اس کو سیاست کے سوا کوئی اور کرنے کا کام معلوم ہی نہ تھا۔ ہر ایک بس سیاست کے میدان میں اپنی سرگرمیاں دکھاتا رہا۔ سیاست کے باہر اس کو کوئی کام نظر نہ آیا جس میں وہ اپنے کو یا اپنے ساتھیوں کو مصروف کرے۔

دور جدید کے انقلاب نے ہمارے لئے جو سب سے بڑا میدان کھولا وہ اسلامی دعوت کا میدان تھا۔ اس دور میں پہلی بار مذہب پر آزادانہ غور و فکر کی فضا پیدا ہوئی۔ جدید حالات نے اس کو ممکن بنایا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے اہتمام میں مذہبی اور روحانی کانفرنس کریں، اور دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کے نمائندوں کو بھی دعوت دیں کہ آپ وہاں آکر اسلام کی تعلیمات پیش کریں۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے سفر کو اور پیغام رسانی کے عمل کو بے حد آسان بنا دیا۔

مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار مذاہب کی آزادانہ تحقیق کی گئی۔ اس تحقیق نے خالص علمی اور تاریخی طور پر یہ ثابت کیا کہ تمام مذاہب غیر معتبر ہیں۔ مذاہب کی فہرست میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علمی طور پر ثابت شدہ اور تاریخی طور پر قابل اعتبار ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ ہر دوسرے مسئلہ کو نظر انداز کر کے اسلام کے

پیغام رحمت کو تمام قوموں تک پہنچائیں۔ مگر مسلمانوں نے اس کے بالکل برعکس عمل کیا۔ انھوں نے اسلام کی پیغام رسانی کے کام کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اور نام نہاد سیاسی جہاد میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ حتی کہ ان کا یہ حال ہوا کہ ان کے بڑے بڑے رہنماؤں تک کو شعور کے درجہ میں بھی اس کا احساس نہ رہا کہ اسلام کی دعوت بھی کوئی کام ہے جس کے لئے انھیں دوسری قوموں کے درمیان متحرک ہونا چاہئے۔ آج کوئی مسلم جماعت تو درکنار، پوری مسلم دنیا میں کوئی قابل ذکر فرد بھی نہیں جس کو حقیقی طور پر دعوت الی اللہ کا شعور ہو، اور وہ اس اہم ترین کام میں فی الواقع اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام سے دعوت الی اللہ کے معاملہ میں جزئی اور اجتہادی کوتاہی ہوئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ مچھلی کے پیٹ میں ڈال دئے گئے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے یہی کوتاہی مکمل طور پر اور بدترین طور پر کی ہے۔ یہ بلاشبہ اللہ کی ناراضگی کی بات ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں پوری ملت مسلمہ مسائل کے پیٹ میں ڈال دی گئی۔ مسائل کی مچھلی نے ان کو نگل رکھا ہے۔ یہ حالت کسی ایک ملک کی نہیں۔ ہندستان، پاکستان، بلاد عربیہ، اور دوسرے تمام علاقوں کے مسلمان مسائل کے شکنجہ میں گرفتار ہیں۔ ان کی ہر کوشش اس کی شدت میں اضافہ کر رہی ہے، وہ اس میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

"مسائل کی مچھلی" کے پیٹ سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے۔ مسلمان اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہوں۔ وہ دوسری قوموں کو حریف اور رقیب سمجھنے کا مزاج ختم کریں۔ وہ ان سے مدعو والا معاملہ کریں۔ وہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ یہی مسائل کے پیٹ سے نکلنے کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا راستہ نہیں جو انھیں اس گرفتاری سے نجات دینے والا ہو۔

سجدۂ فطرت

اس صفحہ کے نیچے ایک تصویر دی جارہی ہے۔ اس میں ایک آدمی "سجدہ" کی حالت میں نظر آتا ہے۔ مگر یہ مسجد کا یا نماز کا سجدہ نہیں ہے بلکہ فطرت کا سجدہ ہے۔ یہ ہندستانی پارلیمنٹ کے نئے ممبر سباش چندر نایک ہیں۔ ۹ جولائی ۱۹۹۱ کو جب وہ پہلی بار پارلیمنٹ ہاؤس پہنچے تو اس کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ان کے اندر غیر معمولی طور پر احترام کا جذبہ ابھرا۔ وہ بے تابانہ طور پر پارلیمنٹ کے سامنے سجدہ کی مانند گر پڑے۔

سجدہ کی حالت آخری سپردگی کی حالت ہے۔ انسان کے اندر جب کسی چیز کے لئے تسلیم وسپردگی کا جذبہ کامل طور پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس چیز کے آگے ڈال دینا چاہتا ہے، اس وقت اس کا جسمانی وجود جس آخری حالت میں ڈھل جاتا ہے وہی سجدہ ہے۔ سجدہ کی حالت سپردگی کی آخری حالت ہے، اس کے بعد عملی سپردگی کا اور کوئی درجہ نہیں۔ سجدہ کی حالت میں اپنے آپ کو پہنچا کر انسان اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو آخری حد تک حوالہ کئے جانے والے کے آگے حوالہ کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی انسان کے اندر کامل سپردگی کی خواہش ابھرتی ہے تو وہ فوراً سجدہ



Mr Subash Chandra Nayak, Congress MP from Orissa, a first timer in the Lok Sabha, kneels down in symbolic respect to Parliament House, on Tuesday. —TOI

کی حالت میں گر جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ ہے۔

مطبوعہ تصویر ٹائمس آف انڈیا (۱۰ جولائی ۱۹۹۱) کے فوٹو گرافر نے دسویں لوک سبھا کی حلف برداری کی تقریب کے موقع پر کھینچی تھی۔ اس دن اسپیکر کی جانب سے نو منتخب ممبران کو حلف دلاکر دسویں لوک سبھا کی باضابطہ تشکیل کی گئی تھی۔ لوک سبھا میں ۵۰۷ منتخب شدہ ممبر ہیں۔ ان میں سے آدھے ممبران نئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مسٹر سباش چندر نایک ہیں۔ وہ جب نئی دہلی کے پُرعظمت پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے پہنچے اور اس میں داخل ہونے لگے تو وہ واقعہ گزرا جس کو اخباری رپورٹر کے کیمرہ نے ریکارڈ کر لیا۔ پارلیمنٹ کے عظمت و تقدس کا احساس ان پر اس طرح طاری ہوا کہ وہ اس کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

"سجدہ" انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کا پورا وجود اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ کسی کے آگے سجدہ میں گر جانا چاہتا ہے۔ آدمی کے اندر فطری طور پر یہ احساس چھپا ہوا موجود ہے کہ "تو بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں" یہ اندرونی احساس جب شدت اختیار کرکے ظاہری ہیئت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام سجدہ ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ میں نے جن اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے بنایا ہے (الذاریات ۵۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر عبادت اور سجدہ گزاری کا جو جذبہ چھپا ہوا ہے وہ اصلاً خالق کے لئے ہے۔ اس کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی خداوند رب العالمین کا ساجد بن جائے۔ مگر جو لوگ خدا کو پائے ہوئے نہ ہوں وہ اپنی بے خبری کی بنا پر کسی غیر خدا کے سجدہ گزار بن جاتے ہیں۔

اس واقعہ سے مزید یہ بات معلوم ہوئی کہ توحید کی دعوت ایک ایسی دعوت ہے جس کا آدھا مرحلہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ انسان اپنی پیدائشی فطرت کے تحت پیشگی طور پر اپنے اندر یہ آمادگی لئے ہوئے ہے کہ وہ کسی برتر ہستی کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔ اب داعیان حق کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ انسان کو یہ بتادیں کہ تمہاری فطرت جس ہستی کے آگے جھکنا چاہتی تھی وہ ہستی دراصل تمہارا خالق ہے۔

اس معاملے میں فارسی شاعر کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے کہ جنگل کے تمام ہرن اپنا سر ہتھیلی پر لئے ہوئے اس انتظار میں ہیں کہ تو آئے اور ان کا شکار کرے:

همه آهوان صحرا سر خود نهاده برکف   به امید آنکه روزے به شکار خواهی آمد

قرآن کا فلسفہ

غالباً ۱۹۷۰ کی بات ہے۔ میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو ایک یونی ورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اسلام کے فلسفیانہ فکر پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسلام میں ثانوی عقلیت (secondary rationalism) ہے۔ اسلام میں ابتدائی عقلیت (primary rationalism) نہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اسلامی فکر کا آغاز وحی کے عقیدہ سے ہوتا ہے۔ آدمی پیشگی طور پر وحی کو مسلّم صداقت مان کر سوچنا شروع کرتا ہے۔ جب کہ عام انسانی فلسفہ میں کوئی چیز پیشگی مسلّمہ کے طور پر نہیں مانی جاتی۔ بلکہ تحقیق و جستجو کے بعد جو بات ثابت ہوتی ہے اس کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ مگر میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ اس دنیا میں انسان کے لیے ثانوی عقلیت ہی ممکن ہے۔ ابتدائی عقلیت موجودہ دنیا میں انسان کے لیے قابلِ عمل اور قابلِ حصول نہیں۔

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کو صرف محدود عقلی صلاحیت حاصل ہے۔ حقائق کی کائنات لامحدود ہے اور اس کے مقابلہ میں انسان کی عقل انتہائی محدود۔ اس لیے ابتدائی عقلیت کا اصول ایک دل پسند اصول تو ہو سکتا ہے مگر اس دنیا میں وہ قابل عمل اصول نہیں۔

خالص فنی اعتبار سے اسلام کی عقلیت اگرچہ ثانوی عقلیت ہے مگر وہ عام معنوں میں ادعائیت (dogmatism) کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کے بارے میں ایک بیان (statement) دیتا ہے۔ اور اس کے بعد انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس بیان کو واقعات معلومہ (known facts) پر جانچ کر دیکھو۔ اگر تم پاؤ کہ یہ بیان واقعات معلومہ سے مطابقت رکھتا ہے تو تم کو مان لینا چاہیے کہ یہ عین درست ہے۔

علم کیا ہے، اور انسان اس علم تک کس طرح پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے، اس سلسلہ میں جدید سائنس نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ علم تک پہنچنے کے تین مرحلے ہیں :

۱۔ مشاہدہ (observation)

۲۔ مفروضہ (hypothesis)

۳۔ تصدیق (verification)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاً آدمی کے سامنے کچھ واقعات آتے ہیں۔ ان واقعات کی توجیہہ کے لیے اس کے ذہن میں ایک مفروضہ قائم ہوتا ہے۔ اب وہ مزید مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اگر مزید یا وسیع تر مطالعہ اس کے مفروضہ کی تصدیق کرے تو مان لیا جائے گا کہ وہ حقیقت ہے۔ اس آخری مرحلہ میں پہنچ کر ابتدائی مفروضہ ثابت شدہ حقیقت (proved fact) بن جاتا ہے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ زمین پر قدیم انسان نے دیکھا کہ یہاں خشکی کے حصے بھی ہیں اور سمندر بھی۔ اس نے ابتدائی طور پر یہ مفروضہ قائم کیا کہ زمین پر آدھا حصہ خشکی ہے اور آدھا حصہ پانی۔ یہ مفروضہ یونانی فلسفیوں کے زمانے سے لے کر ابن خلدون تک قائم رہا۔

اس کے بعد خشکی اور سمندر کے سفروں سے آدمی نے یہ جانا کہ خشکی کے مقابلے میں پانی کا حصہ زمین پر زیادہ ہے۔ اس دوسرے مشاہدے سے پہلا مفروضہ رد ہوگیا۔ اب دوسرا مفروضہ یہ قائم ہوا کہ زمین پر پانی کا حصہ دو تہائی ہے اور خشکی کا حصہ ایک تہائی۔ اس کے بعد مزید ذرائع انسان کو حاصل ہوئے اور یہ ممکن ہوگیا کہ خشکی کے حصے اور پانی کے حصے کی باقاعدہ پیمائش کی جا سکے۔ چنانچہ باقاعدہ پیمائش سے معلوم ہوا کہ زمین کی سطح پر پانی کا حصہ ۷۱ فی صد ہے اور خشکی کا حصہ ۲۹ فی صد۔ بعد کے اس مشاہدہ نے دوسرے مفروضہ کی تصدیق کر دی اور وہ مسلّمہ حقیقت کے طور پر مان لیا گیا۔

قرآن کا فلسفہ بھی تقریباً یہی ہے۔ البتہ مقدمات کی ترتیب کے اعتبار سے دونوں میں معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ قرآن کا فلسفہ یا قرآن کا طریق تفکیر معمولی فرق کے ساتھ یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے "مفروضہ" قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد "مشاہدہ" کی روشنی میں اس پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر میں "تصدیق" کا درجہ آتا ہے۔ یعنی قرآن کے دعویٰ (مفروضہ) کو لے کر اس پر غور کرنا۔ اور پھر غور و فکر کی سطح پر مفروضہ کی واقعیت ثابت ہونے کے بعد اس کو مسلّمہ حقیقت مان لینا۔ اسی آخری درجۂ معرفت کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے۔

گویا سائنس کے طریق علم کی ترتیب یہ ہے کہ مشاہدہ۔ مفروضہ۔ تصدیق۔ اس کے بجائے قرآن کے طریق علم کی ترتیب یہ ہے کہ مفروضہ۔ مشاہدہ۔ تصدیق:

Science: observation—hypothesis—verification.
Qur'an : hypothesis—observation—verification.

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام انسانی فلسفہ میں فکر کا آغاز تلاش (pursuit) سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی فلسفہ میں فکر کا آغاز یافت (finding) سے ہوتا ہے۔ قرآن ابتداءً یہ دعویٰ یا علمی زبان میں مفروضہ پیش کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اس کائنات کا ایک انجام ہے۔ اس کے بعد قرآن تخلیقی دنیا کے مختلف شواہد (آیات) انسان کے سامنے لاتا ہے۔ اور انسان سے کہتا ہے کہ ان شواہد پر غور کرو اور دیکھو کہ کیا یہ شواہد قرآن کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔

اب تک کے تجربات بتاتے ہیں کہ کائنات کے تمام حقائق معلومہ (known facts) قرآن کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں۔ کوئی بھی معلوم حقیقت ایسی نہیں جو قرآن کے بیان سے ٹکرانے والی ہو یا اس کو مشتبہ ثابت کرتی ہو۔

اس کی ایک مثال لیجئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں یہ اعلان کیا کہ مجھ پر خدا نے اپنے فرشتے کے ذریعہ وحی بھیجی ہے۔ اس پر مکہ کے لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری بات کو صرف اس وقت مانیں گے جب کہ ہم اپنی آنکھ سے دیکھیں کہ فرشتہ خدا کی وحی لے کر آسمان سے تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ لوگ تم سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وحی خدا کے حکم سے ہے اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے (بنی اسرائیل ۸۵)

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ مکہ کے لوگ پیغمبر اسلام کے دعویٰ رسالت پر براہِ راست دلیل مانگ رہے تھے۔ مگر قرآن نے یہ جواب دیا کہ تم اس معاملہ کو بالواسطہ دلیل یا استنباطی دلیل کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ تم اپنی محدودیت کی وجہ سے اس معاملہ میں براہ راست دلیل کا تحمل نہیں کر سکتے۔

یہ معاملہ اسی طرح متنازعہ صورت میں تاریخ میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹ ویں صدی میں سائنسی ذرائع کی دریافت کے بعد جدید مفکرین نے مزید یقین کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں کسی معاملہ میں بالواسطہ یا استنباطی استدلال پر قانع رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جدید ذرائع کی مدد سے تمام امور پر براہِ راست دلیل قائم کر سکتے ہیں۔

مگر بیسویں صدی کی تحقیقات نے آخری طور پر قرآن کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی ذہنی محدودیت فیصلہ کن طور پر اس راہ میں حائل ہے کہ وہ کسی بھی حقیقت پر

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام انسانی فلسفہ میں فکر کا آغاز تلاش (pursuit) سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی فلسفہ میں فکر کا آغاز یافت (finding) سے ہوتا ہے۔ قرآن ابتداءً یہ دعویٰ یا علمی زبان میں مفروضہ پیش کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اس کائنات کا ایک انجام ہے۔ اس کے بعد قرآن تخلیقی دنیا کے مختلف شواہد (آیات) انسان کے سامنے لاتا ہے۔ اور انسان سے کہتا ہے کہ ان شواہد پر غور کرو اور دیکھو کہ کیا یہ شواہد قرآن کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔

اب تک کے تجربات بتاتے ہیں کہ کائنات کے تمام حقائق معلومہ (known facts) قرآن کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں۔ کوئی بھی معلوم حقیقت ایسی نہیں جو قرآن کے بیان سے ٹکرانے والی ہو یا اس کو مشتبہ ثابت کرتی ہو۔

اس کی ایک مثال لیجئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں یہ اعلان کیا کہ مجھ پر خدا نے اپنے فرشتے کے ذریعہ وحی بھیجی ہے۔ اس پر مکہ کے لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری بات کو صرف اس وقت مانیں گے جب کہ ہم اپنی آنکھ سے دیکھیں کہ فرشتہ خدا کی وحی لے کر آسمان سے تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ لوگ تم سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وحی خدا کے حکم سے ہے اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے (بنی اسرائیل ۸۵)

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ مکہ کے لوگ پیغمبر اسلام کے دعویٰ رسالت پر براہِ راست دلیل مانگ رہے تھے۔ مگر قرآن نے یہ جواب دیا کہ تم اس معاملہ کو بالواسطہ دلیل یا استنباطی دلیل کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ تم اپنی محدودیت کی وجہ سے اس معاملہ میں براہ راست دلیل کا تحمل نہیں کر سکتے۔

یہ معاملہ اسی طرح متنازعہ صورت میں تاریخ میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹ ویں صدی میں سائنسی ذرائع کی دریافت کے بعد جدید مفکرین نے مزید یقین کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں کسی معاملہ میں بالواسطہ یا استنباطی استدلال پر قانع رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جدید ذرائع کی مدد سے تمام امور پر براہ راست دلیل قائم کر سکتے ہیں۔

مگر بیسویں صدی کی تحقیقات نے آخری طور پر قرآن کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی ذہنی محدودیت فیصلہ کن طور پر اس راہ میں حائل ہے کہ وہ کسی بھی حقیقت پر

براہ راست دلیل قائم کر سکے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں متفقہ طور پر مان لیا گیا کہ بالواسطہ یا استنباطی استدلال عین معقول استدلال (valid arguments) ہے، بشرطیکہ وہ ثابت شدہ شاہدات پر مبنی ہو اور تمام متعلق مشاہدات کی زیادہ بہتر توجیہ کرتا ہو۔

مثال کے طور پر نظریۂ ارتقاء (Evolution theory) کو اسی بنا پر سائنس دانوں کے درمیان عمومی قبولیت (general acceptance) کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ حتی کہ کچھ لوگوں نے اس کو ثابت شدہ حقیقت (proved fact) کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ارتقاء کا نظریہ اتنے لمبے ماضی سے تعلق رکھتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے عمل کا براہ راست مشاہدہ کیا جا سکے یا اس پر براہ راست دلیل قائم کی جائے۔ ارتقاء کا نظریہ تمام تر ایک استنباطی نظریہ ہے نہ کہ براہ راست مشاہدہ میں آنے والا نظریہ۔

نظریۂ ارتقاء کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کا فارمولا چند لفظوں میں یہ ہے ـــــ دوبارہ پیدائش، فرق اور فرق کا باقی رہنا :

Reproduction, Variation and Differential survival

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حیوان کے یہاں توالد و تناسل سے بچے پیدا ہوئے۔ ان میں باہم فرق تھا۔ مثلاً کوئی چھوٹا تھا کوئی بڑا۔ بڑے بچے توالد و تناسل کے عمل کے تحت دوبارہ تھوڑا تھوڑا بڑے ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بکری کا بچہ لمبی مدت تک فرق جمع ہونے کے نتیجہ میں زرافہ بن گیا۔ ارتقاء پسند عالم ایک طرف بکری کے ڈھانچہ کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف زرافہ کے ڈھانچہ کو، اور پھر وہ فرض کر لیتا ہے کہ ان دونوں کے بیچ میں اور بہت سی نسلیں ہیں جو ان دونوں کو جوڑتی ہیں۔ گویا وہ دو چیزوں کی موجودگی سے تیسری چیز کی موجودگی کا قیاس کرتا ہے۔

اس سے قطع نظر کہ یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، منطقی اعتبار سے یہ استدلال سراسر استنباطی استدلال ہے۔ اسی طرح کے استنباطی استدلالات پر ان تمام نظریات کی بنیاد قائم ہے جن کو موجودہ زمانے میں سائنٹفک نظریات کہا جاتا ہے۔

سائنس کے حلقے میں جتنے بھی نظریات قائم کیے گئے ہیں وہ سب اسی طرح بالواسطہ استدلال پر مبنی ہیں۔ یہ نظریات اس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک کوئی نیا مشاہدہ سابقہ توجیہہ یا

استنباط کو مشتبہ ثابت نہ کر دے۔

اسلامی عقائد پر منطقی استدلال کی نوعیت بھی عین یہی ہے۔ اگر کائناتی مشاہدات اسلامی عقائد کی تائید کرتے ہوں اور ان مشاہدات سے جائز طور پر ان کا استنباط ہو رہا ہو تو وہ عین جدید سائنسی منطق کے مطابق درست اور قابل تسلیم قرار پائیں گے۔ صرف اس بنا پر ان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ استنباطی استدلال پر مبنی ہیں۔ ایسا کرنے کے بعد صرف اسلامی عقائد ہی رد نہیں ہوں گے بلکہ خود سائنس کا پورا قلعہ بھی مکمل طور پر منہدم ہو جائے گا۔

قرآن میں ۱۴۰۰ سال پہلے یہ کہا گیا تھا کہ انسان کو صرف علم قلیل (بنی اسرائیل ۸۵) دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں خالص سائنسی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسانی ذہن کی کچھ ناگزیر محدودیتیں (limitations) ہیں اور ان محدودیتوں کی وجہ سے انسان کے لیے صرف محدود علم تک پہنچنا ممکن ہے۔ چنانچہ جدید سائنسی منطق کا یہ کہنا ہے کہ ہم اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ صرف قرینہ (probability) تک پہنچ سکتے ہیں۔ قرینے سے آگے ہمارے علم کی رسائی ممکن نہیں۔

جدید سائنس کا یہ موقف اسلام کی اس عقلیت کو برحق ثابت کرتا ہے جس کو ثانوی عقلیت کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سائنس کا موقف اور اسلام کا موقف دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ سائنس کا موقف جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں یہ ہے کہ ہم ایک مفروضہ قائم کریں اور ممکن تجربات اور مشاہدات پر ان کو جانچیں۔ اگر ہمارے تجربات اور مشاہدات اس مفروضہ کی تصدیق کریں تو ہمیں گمان کرنا چاہیے کہ مفروضہ درست ہے۔

عین یہی موقف اسلامی فلسفہ کا بھی ہے۔ اسلام یہ کرتا ہے کہ وہ وحی کی صورت میں ہمارے سامنے ایک "مفروضہ" رکھ دیتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ مشاہدات اور تجربات کی جو بھی معلوم مقدار ہے، اس پر جانچ کر اسے دیکھو۔ اگر معلوم مشاہدات اور تجربات اس سے نہ ٹکرائیں، بلکہ وہ اس کی تصدیق کریں تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ وحی کی صورت میں جو مفروضہ قائم کیا گیا وہ عین درست ہے۔

نیوٹن نے دیکھا کہ سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اس سے اس نے یہ نظریہ یا مفروضہ قائم کیا کہ زمین میں کھینچنے کی طاقت ہے۔ اس واقعہ میں سیب کا گرنا ایک مشہود واقعہ ہے، مگر زمین کی قوت کشش ایک غیبی واقعہ۔ اس واقعہ میں سائنس داں نے ایک غیبی واقعہ کو صرف اس لیے مان لیا کہ

ایک مشہود واقعہ اس کی موجودگی کا قرینہ پیش کر رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس نے "گر نے "کو دیکھ کر "گرانے والے" کا اقرار کر لیا۔ اصولی طور پر، ٹھیک یہی طریق استدلال قرآن میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن بھی یہی کرتا ہے کہ وہ مشہود حقائق سے غیبی حقائق پر دلیل قائم کرتا ہے۔ وہ واقعہ کی بنیاد پر صاحب واقعہ کو ماننے کی دعوت دیتا ہے۔

اس طرز استدلال کی ایک مثال قرآن میں یہ ہے : افعیینا بالخلق الاول بل ھم فی لبس من خلق جدید (کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے، بلکہ یہ لوگ از سر نو پیدا کرنے کی طرف سے شبہ میں ہیں) ۵۰/۵۱

سورہ ق کی اس آیت میں تخلیق اول سے تخلیق ثانی پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس استدلال کی منطق یہ ہے کہ پہلے زندگی بعد موت کا "دعویٰ" پیش کیا گیا۔ اس کے بعد زندگی قبل موت کا مشاہدہ سامنے لایا گیا۔ اور پھر کہا گیا کہ جب پہلی بار بے زندگی سے زندگی کا وجود میں آنا ممکن تھا تو دوسری بار بے زندگی سے زندگی کا وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو گا۔

انسان خود اپنے وجود کی صورت میں اور دوسرے بے شمار انسانوں کی موجودگی کی صورت میں پہلی تخلیق کا تجربہ کر رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ انسان ایک مکمل وجود کے طور پر پہلی بار دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد وہ مر کر دوبارہ اپنی قبل از پیدائش حالت کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔

گویا کہ انسان حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آیا۔ اور اس کے بعد پھر حالتِ موت میں چلا گیا۔ اب اگر ایک بار حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آنا ممکن تھا تو دوسری بار حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آنا کیوں ناممکن ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی بار زندگی کا ثابت ہونا، دوسری بار زندگی کو اپنے آپ ثابت کر دیتا ہے۔

برٹرینڈ رسل ایک ملحد فلسفی ہے۔ مگر اس نے بالواسطہ طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ اہلِ مذاہب کے دلائل میں کم از کم ایک دلیل ایسی ہے جس کو منطقی دلیل (logical argument) کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظم کے ذریعہ استدلال (argument from design) ہے جس سے خدا کے وجود کو ثابت کیا جاتا ہے، یعنی جب دنیا میں نظم ہے تو لازم ہے کہ اس کا ایک ناظم بھی ہو۔

برٹرینڈرسل نے اگرچہ خود اس دلیل کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ تاہم وہ مانتا ہے کہ اپنی نوعیت (nature) کے اعتبار سے یہ دلیل ایک خالص سائنسی دلیل ہے۔

Bertrand Russell, *Why I am not a Christian*, p. 9

حقیقت یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے، قرآن کے استدلال اور سائنس کے استدلال میں کوئی فرق نہیں۔ تمام سائنسی نظریات میں معلوم سے نامعلوم پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں بھی معلوم سے نامعلوم یا شہود سے غیب پر دلیل قائم کی گئی ہے۔ قرآن کا طریق استدلال بھی اتنا ہی سائنٹفک ہے جتنا علوم مادی کا استدلال۔

اسلامی فلسفہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خالص سائنٹفک فلسفہ ہے۔ جو لوگ سائنٹفک فلسفہ کو مانتے ہوں، ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اسلامی فلسفہ کی معقولیت (validity) کو پوری طرح تسلیم کر لیں۔ خالص علمی اعتبار سے، اس موقف کے سوا کوئی اور موقف انسان کے لیے درست نہیں۔

قرآنی فلسفہ اور سائنسی فلسفہ میں اصل فرق مقدمات کی ترتیب کا ہے نہ کہ ثانوی عقلیت اور ابتدائی عقلیت کا۔ موجودہ دنیا میں انسان کے لیے عملاً ایک ہی طریق استدلال ممکن ہے، اور قرآن اور سائنس دونوں کا طریق استدلال بنیادی طور پر یہی ہے۔

ایک سفر

مئی ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں پٹنہ سے مسٹر ایم ٹی خان نے ٹیلیفون پر بتایا کہ پٹنہ کے الرسالہ ریڈرس فورم کی طرف سے یہ طے کیا گیا ہے کہ شہر میں "الرسالہ سمپوزیم" کے نام سے ایک اجتماع کیا جائے۔ یہ تجویز مجھے پسند آئی۔ میں نے فوراً اس کی تائید کی۔ اس کے بعد چند بار ٹیلیفون پر مزید گفتگو ہوئی۔ آخر کار یہ طے پایا کہ پٹنہ میں ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ کو الرسالہ سمپوزیم منعقد کیا جائے۔ پٹنہ کے ساتھیوں کی خواہش پر مزید یہ طے ہوا کہ میں بھی اس میں شرکت کروں۔

۲۶ جولائی ۱۹۹۱ کی شام کو نئی دہلی سے مگدھ اکسپریس کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ اپنے کیبن میں داخل ہوا تو پہلا احساس یہ تھا کہ انڈیا کا فرسٹ کلاس باہر کے ملکوں کے سکنڈ کلاس سے بھی کمتر ہے۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں، مثلاً سنگاپور اور کوریا میں آپ جائیں تو ہر طرف آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ آپ ایک ترقی یافتہ ملک میں چل رہے ہیں۔ وہاں کی ہر چیز جدید معیار کے مطابق نظر آئے گی۔ مگر انڈیا میں کوئی بھی چیز جدید معیار ترقی کے مطابق نہیں۔

اسی پسماندگی کی علامت وہ فقرہ تھا جو میرے ٹکٹ کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔ وہ ہندی میں یہ تھا کہ ٹکٹ پر انکت پرستھان سمے میں پریورتن ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک تجربہ مجھ کو یہ ہوا کہ مگدھ اکسپرس جاتے ہوئے شاید اتفاقاً وقت پر پٹنہ پہنچ گئی۔ مگر واپسی میں یہی گاڑی دو گھنٹہ لیٹ ہو کر دہلی پہنچی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس قسم کی تاخیر ناقابل برداشت سمجھی جاتی ہے، کیوں کہ وہ قومی دولت کے ضیاع کے ہم معنی ہے۔ مگر جہاں پانے کی تڑپ نہ ہو وہاں کھونے کا احساس بھی اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ میں فرانس تباہ ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ تیز رفتار ٹرین فرانس میں ہے۔ جاپان کی بولیٹ ٹرین کے مقابلہ میں فرانس نے ٹی جی وی ٹرین بنائی ہے۔ ان ٹرینوں کی اوسط رفتار ۲۷۰ سے ۳۰۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔ ۱۹۸۱ میں پیرس اور لیونز کے درمیان اس تیز رفتار ٹرین نے ۱۴۰ ملین مسافر منتقل کئے اور ایک بھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔ فرانس ریلوے نے مسافر کے بغیر نمائش کے طور پر ایک ٹرین پیرس اور تورس کے درمیان چلائی۔ یہ ٹرین ۵۱۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل کر اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ یہ رفتار بعض ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد فرانس یورپ کا ایک کمزور ملک بن گیا تھا۔ اس کی ریلوے یورپ کی سب سے زیادہ ناقص ریلوے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس نے اپنے اوپر افریقہ کے مقبوضات (الجیریا وغیرہ) کا بوجھ لاد رکھا تھا جن کو وہ فرانس کا حصہ کہتا تھا۔ فرانس کے سابق صدر جنرل ڈیگال نے طے کیا کہ افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا جائے۔ ڈیگال کا یہ فیصلہ فرانس کے قومی وقار کے خلاف تھا۔ لوگوں نے کہا کہ ڈیگال فرانس کو پست اور ذلیل کر دینا چاہتا ہے۔ ڈیگال نے ۱۹۷۰ میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

On the slope that France is climbing, my mission is always to guide her toward the heights, while all the voices from below call on her ceaselessly to come down again.

فرانس اس وقت ڈھلوان پر چڑھ رہا ہے۔ میرا مشن یہ ہے کہ اس کو اوپر اٹھاؤں، جب کہ دوسرے لوگ اس لئے چیخ پکار کر رہے ہیں کہ اس کو دوبارہ نیچے کی طرف دھکیل دیں (ٹائم میگزین ۱۵ جولائی ۱۹۹۱)

ڈیگال نے اپنی نامقبولیت کا خطرہ مول لے کر افریقہ کے مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اس کے فوراً بعد فرانس ترقی کرنے لگا۔ آج فرانس دنیا کا پانچواں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ مستقبل کی ترقی کے لئے حال کی بے ترقی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس قربانی کے بغیر کسی کو ترقی کا اعلیٰ مقام حاصل نہیں مل سکتا۔

ٹرین کے ایک ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارے ملک کے جس پہلو کو دیکھا جائے اس پر پسماندگی کی چھاپ پڑی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کا سبب بنیادی طور پر ایک ہے۔ اور وہ ملک کی یہ بدقسمتی ہے کہ ۱۹۴۷ میں جب ملک آزاد ہوا تو اس کی لیڈرشپ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں چلی گئی جو ذہنی طور پر پوری طرح سوشلسٹ تھا۔ سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو آزادی سے پہلے اپنی آپ بیتی میں لکھ چکے تھے کہ ہمارے مسائل کا کوئی بھی حل اشتراکی نظام (Socialist order) کے سوا نہیں ہے، پہلے قومی دائرہ میں، اور پھر ساری دنیا میں، جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے (آٹوبیاگرافی، لندن ۱۹۳۶، صفحہ ۵۲۳) جس اشتراکی نظام نے روس کو برباد کیا، اسی نے انڈیا کو بھی برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

میرے ایک ہم سفر نے ۲۷ جولائی ۱۹۹۱ کا ہندی اخبار "آج" خریدا۔ میں نے دیکھا تو اس کے اندر کے صفحہ پر ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا: پنڈت نہرو بنام من موہن سنگھ۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ موجودہ وزیر مالیات نے کس طرح نہرو کی سابقہ اقتصادی پالیسی کو بدل کر اس کو بالکل دوسرے رخ پر ڈال دیا ہے۔ انڈیا ٹوڈے (۱۵ اگست) نے اس انقلابی واقعہ پر یہ سرخی لگائی ہے کہ لائسنس راج کا خاتمہ (Ending the Licence Raj) ٹائم میگزین (۵ اگست) نے اس کے بارہ میں دو صفحہ کی رپورٹ چھاپی ہے اور اس کی سرخی یہ ہے:

After nearly a half-century of socialist controls, a new government ventures to catch the free-market winds sweeping the world. (p. 22)

کانگرس پارٹی کا ڈائمنڈ جوبلی سشن جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں ہوا تھا۔ اس موقع پر سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے تالیوں کی گونج میں یہ رزولیوشن منظور کرایا کہ ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج (Socialistic pattern of society) بنایا جائے گا (نیشنل ہیرالڈ ۲ جنوری ۱۹۵۵)

اسی زمانہ میں راقم الحروف نے ۴۸ صفحہ کی ایک کتاب (ہندستان کی منزل) شائع کی تھی۔ اس میں بتایا تھا کہ سوشلزم ہمارے ملک کو تباہ کر دے گا۔ آج یہ الفاظ واقعہ بن چکے ہیں۔ اب موجودہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ اس سوشلسٹ کھنڈر پر ایک نئے ہندستان کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم موجودہ حالات میں اس کی کامیابی کے بارہ میں زیادہ پر امید رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

۱۹۱۷ میں جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو اس نے اتنے طاقت ور انداز میں اس کی فرضی خوبیوں کا پروپگنڈا کیا کہ ساری دنیا میں سوشلزم کا لفظ ترقی پسندی کا نشان بن گیا۔ مگر ۷۵ سال بعد آج ہر شخص سوشلزم کو بربادی کا جیل خانہ سمجھ رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک نظریہ لفظی طور پر انتہائی حسین ہونے کے باوجود عملی طور پر انتہائی حد تک تباہ کن ہو سکتا ہے۔

درمیان میں ایک چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ حالاں کہ یہ اس کے رکنے کا اسٹیشن نہ تھا۔ چند منٹ بعد مقابل کی پٹری سے ایک اور ٹرین شور مچاتی ہوئی آئی اور آگے چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ اس دوسری

ٹرین کو گزارنے کے لئے ہماری ٹرین روکی گئی تھی۔ یہی اس دنیا میں سفر کا قاعدہ ہے۔ یہاں ہر گاڑی کو دوسری گاڑی کے لئے راستہ دینا پڑتا ہے۔ جو گاڑی اس "رعایت" کے لئے تیار نہ ہو وہ خود بھی تباہ ہوگی اور دوسری گاڑی کو بھی تباہ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

یہی اصول انسانی زندگی کا بھی ہے۔ انسانی عمل کی شاہراہ پر بھی بیک وقت بہت سے انسان اپنا اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔ یہاں بھی کسی کے لئے محفوظ سفر کی ضمانت صرف یہ ہے کہ جب بھی دوسرے کسی انسان سے ٹکراؤ کا اندیشہ ہو تو وہ فوراً فریق ثانی کی رعایت کے مذکورہ اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کو گزرنے کا راستہ دیدے۔ جو آدمی ایسا نہ کرے وہ کبھی اپنی مطلوبہ منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

گاڑی الٰہ آباد پہنچی تو ۲ جولائی کی صبح نمودار ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے چاروں طرف تاریکی کا غلاف پڑا ہوا تھا۔ اب چاروں طرف روشنی کی بہار نظر آنے لگی۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا جو اللہ تعالیٰ نے بنائی اور پھر اس کو انسان کی تحویل میں دے دیا۔ کوئی ہے جو اللہ کا شکر ادا کرے۔

ایک صاحب نے کہا کہ خدا نے ہم کو پیدا کر کے ہم کو جنت دوزخ کے جھنجھٹ میں کیوں ڈالا۔ اس نے ہم کو پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اوپر اللہ کے بے شمار احسانات ہیں اور سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کے لئے ابدی جنت کے حصول کے امکانات کھول دئے۔ اللہ نے انسان کو غیر موجود سے موجود کیا۔ اس کو حیرت انگیز صلاحیتیں عطا کیں۔ اور پھر اس کو احساسِ لذت دیا جو ساری کائنات میں انتہائی نادر چیز ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس نے ایک ابدی لذت گاہ (جنت) پیدا کی۔ اللہ نے اس ابدی لذت گاہ کی ایک انتہائی وقتی قیمت مقرر کی۔ اس نے کہا کہ جو شخص موجودہ دنیا کی مختصر مدت میں حالتِ غیب میں خدا کا اعتراف کرے گا اور کسی مجبوری کے بغیر خود اپنے اختیار سے اس کے آگے جھک جائے گا، اس کو موت کے بعد اس ابدی لذت گاہ میں بسنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ یہ کتنی بڑی چیز کی کتنی چھوٹی قیمت ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ صدیاں گزر گئیں اور آدمی اس جہانِ لذت کو پانے کا شوق نہ کر سکا۔

آخرت کی اس دنیائے لذت کو پانے کا موقع انسان کو صرف ایک بار ملا ہے۔ اس کے بعد یہ موقع ابدی طور پر ختم ہو جائے گا۔ مگر اس واحد قیمتی موقع کو انسان انتہائی بے دردی کے ساتھ کھو رہا ہے۔ کیسا عجیب ہے وہ انسان جو سب سے بڑی نعمت کے ساتھ سب سے بڑی بے اعتنائی کرے۔

مسٹر مہیش گوپ (Mahesh Gope) میرے ہم سفر تھے۔ ان کا تعلق ائر فورس سے ہے۔ وہ نئی دہلی میں ائر فورس کے ہیڈ کوارٹر میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ ایک نیتا کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اتفاق سے نیتا صاحب کے کچھ نوٹ گم ہو گئے۔ وہ دوسرے مسافر پر شبہہ کرنے لگے۔ مسٹر مہیش گوپ نے تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ خود نیتا جی کی غفلت سے نوٹ پھسل کر سیٹ کے نیچے چلے گئے تھے۔ اور وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی کوئی بات بگڑے تو آپ اپنے آپ کو بلیم دیجئے۔ ہمارے سماج میں ساری خرابی اسی سے آئی ہے کہ آدمی فوراً دوسرے کو بلیم دینے لگتا ہے۔

دلدار نگر اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اچانک پلیٹ فارم پر نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر۔ نعرۂ رسالت، محمد رسول اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ ایک صاحب حج کر کے آئے ہیں اور اسی ٹرین سے یہاں اترے ہیں۔ حاجی صاحب کے استقبال کے لئے بہت سے مسلمان پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ جیسے ہی حاجی صاحب اپنی بوگی سے باہر آئے، مسلمانوں کے نعروں سے پلیٹ فارم گونج اٹھا۔

میں نے سوچا کہ خدا اور رسول کا نام صحابۂ کرام کے لئے "عمل" کا عنوان تھا، موجودہ مسلمانوں کے لئے وہ "نعرہ" کا عنوان بن گیا ہے۔ یہی وہ اصل خرابی ہے جس کی بنا پر آج یہ حالت ہو رہی ہے کہ دین کے مظاہر تو مسلمانوں کے یہاں خوب ہیں مگر دین کی حقیقت کا ان کے یہاں کوئی وجود نہیں۔

ایک رات اور آدھا دن ٹرین میں گزارنے کے بعد ۲۷ جولائی کی دوپہر کو پٹنہ پہنچا۔ یہاں میرے جو ساتھی اسٹیشن پر موجود تھے ان میں سے ایک صاحب کالی وردی میں تھے۔ ان کے کوٹ پر ریلوے سروس کا بلا لگا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر ان کے دفتر کے کمرہ میں کچھ وقت گزارنے کے بعد ہم لوگ عدالت گنج کے لئے روانہ ہوئے جہاں مسٹر ایم ٹی خان کے مکان پر مجھے قیام کرنا تھا۔

شام کو ایک صاحب ملنے کے لئے آئے۔ وہ سفید کپڑے میں ملبوس تھے۔ میں ان کو پہچان نہ سکا۔ انھوں نے بتایا کہ میں وہی ہوں جو ریلوے اسٹیشن پر آپ سے ملا تھا۔ لباس کے فرق کی بنا پر ان کو پہچاننے میں مجھے مشکل ہوئی۔ یہ ایک سادہ انسانی تجربہ ہے۔ مگر اسی قسم کے تجربہ کی مضمون بندی کر کے شاعر نے اس سے وحدت وجود کا مسئلہ نکال لیا اور کہا:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

ایک شخصیت کا مختلف لباس پہننے کے باوجود ایک رہنا بجائے خود ایک واقعہ ہے۔ مگر اس مثال

سے یہ الٰہیاتی نظریہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ ظاہری پیکر خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، سب کے اندر ایک ہی عظیم ہستی چھپی ہوئی ہے۔

میرا طریقہ ہے کہ جب مجھے کسی مقام کا سفر کرنا ہوتا ہے تو اس مقام کے بارہ میں کتابوں سے معلومات حاصل کرتا ہوں۔ چنانچہ پٹنہ کے بارہ میں مختلف کتابیں دیکھیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں پٹنہ کے بارہ میں ایک صفحہ کا مضمون ہے۔ اس کے لکھنے والے پروفیسر بیج ناتھ پوری ہیں۔

یہ شہر ۴۸۷ ق م میں پاٹلی پتر کے نام سے آباد کیا گیا۔ پھر وہ پاٹن بنا اور آخر میں پٹنہ ہو گیا۔ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ پٹنہ کی تاریخ کے بارہ میں ساتویں صدی سے لے کر ۱۵۴۱ تک کچھ معلوم نہیں ہے، جب کہ افغان حکمراں شیر شاہ سوری نے پٹنہ کے نام سے دوبارہ اس کی بنیاد ڈالی:

Nothing is known of its history from the 7th century untill 1541, when it was refounded as Patna by the Afghan ruler Sher Shah. (13/1076)

شیر شاہ سوری نے تقریباً نو سو سال بعد پٹنہ کو از سرِ نو آباد کیا۔ مگر اس نے اس شہر کا نام شیرآباد نہیں رکھا بلکہ پٹنہ رکھا۔ لیکن بعد کو اورنگ زیب (وفات ۱۷۰۷) آیا تو اس نے پٹنہ کا نام اپنے پوتے عظیم کے نام پر عظیم آباد رکھ دیا۔ حالاں کہ اس کے بعد ۱۷۶۵ میں یہ شہر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں جا کر دوبارہ پٹنہ بن جانے والا تھا۔ اور خود شہزادہ عظیم کے لئے مقدر تھا کہ وہ تاریخ کے اندھیرے میں گم ہو کر رہ جائے۔

پٹنہ میں شہری اعتبار سے جو کچھ میں نے دیکھا اس کی نمائندگی ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل ایس کے سنہا کے ایک مضمون سے ہوتی ہے۔ یہ مضمون ٹائمس آف انڈیا کے پٹنہ اڈیشن (۲۸ جولائی ۱۹۹۱) میں چھپا تھا۔ اور اس کا عنوان تھا —— پٹنہ نراشں کا شہر:

Patna: Tne City of Despair

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ صدی کے نصف اول میں پٹنہ کی آبادی تقریباً ایک لاکھ تھی۔ اب اس کی آبادی ایک ملین سے اوپر ہے۔ اسی نسبت سے انتظامی سروسوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مگر ورک کلچر (work culture) پیدا نہ ہونے کی بنا پر شہر گندگی، اور بدعنوانی کا اڈہ بنا ہوا ہے۔

پٹنہ کی سڑکوں پر ٹریفک جام ہونا ایک معمول کا واقعہ بن چکا ہے۔ سڑکوں پر گندگی شاید ملک کے تمام شہروں سے زیادہ ہے۔ اس قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا تھا کہ پہلے یہ حال تھا کہ

گایوں اور بھینسوں کو سڑکوں پر پھرنے اور گندگی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر اب حالات مختلف ہیں۔ آج مذہبی اور سیاسی اسباب سے ہم گایوں اور بھینسوں کو سڑکوں پر گھومنے سے نہیں روک سکتے:

Today for religious and political reasons we may not object to cows and buffaloes having the run of the city.

شہری انتظام اور تمدنی امور کو سائنسی تحقیقات کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ مذہبی عقائد کے تابع۔ جب بھی ان چیزوں کو مذہبی عقیدہ کے تابع کیا جائے گا، انسانی دنیا میں وہی خرابیاں پیدا ہوں گی جس کا ایک چھوٹا سا نقشہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔

روزنامہ قومی آواز دہلی، لکھنؤ اور پٹنہ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۹ جولائی ۱۹۹۱ میں صفحہ اول پر ایک تصویر ہے جس میں ایک امتحان کا منظر دکھایا گیا ہے۔ طلبہ کی نصف تعداد میز پر ہے اور بقیہ نصف زمین پر بیٹھی ہوئی نقل کرنے میں مصروف ہے۔ پاس ہی دو پولیس مین اور چند نگراں کھڑے ہوئے ہیں۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ درج ہیں: بدھ کو پٹنہ کے ایک مقامی مرکز پر امتحان کے دوران انٹر کے طلبہ پولیس اور نگران کی موجودگی میں کھلے عام نقل کرتے ہوئے (تصویر: یو این آئی)

امتحان میں نقل کرنے کا مرض بہت سی دوسری ریاستوں میں بھی ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ بہار میں یہ رواج سب سے زیادہ ہے۔ ہندستان میں بیشتر لوگ پڑھتے نہیں، اور جو لوگ پڑھتے ہیں وہ نقل کرکے امتحان پاس کرنا چاہتے ہیں۔ اس بد مذاقی نے علم کا معیار اتنا زیادہ گرا دیا ہے کہ اب پڑھے ہوئے اور بغیر پڑھے ہوئے انسان میں بہت زیادہ فرق باقی نہیں رہا۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۱ کو بہار ودھان سبھا نے ایک عجیب قسم کا بل پاس کیا۔ اس کا نام ہے ——

(Bihar Bhoodan Yagya (Amendment) Bill 1991) اس قانون کا تعلق اس پندرہ لاکھ ایکڑ زمین سے ہے جس کو آچاریہ ونوبا بھاوے (۱۸۹۵-۱۹۸۲) نے لوگوں سے دان (عطیہ) کے طور پر حاصل کیا تھا۔ ابتدائی قانون میں آچاریہ ونوبا بھاوے کا نام شامل تھا مگر موجودہ ترمیمی قانون میں کسی "ٹکنکل" سبب سے ان کا نام حذف کر دیا گیا ہے۔

میں نے بہار کے بارہ میں مختلف اخباروں میں نہایت سخت رپورٹیں پڑھیں۔ بہار میں کرپشن اپنی انتہا پر ہے۔ مجرمین سیاسی لیڈر بنے ہوئے ہیں۔ پوری ریاست فنکشننگ انارکی کا منظر پیش

کررہی ہے۔ ریاستی حکومت کے لئے زیادہ ضروری تھا کہ وہ ریاست سے بدعنوانی کو حذف کرے، ایک کاغذی دستاویز سے ونوبا بھاوے کا نام حذف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

بہار میں لوک سبھا کی ۵۴ سیٹیں ہیں۔ ان میں سے بیشتر سیٹیں جنتا دل اور اس کے اتحادیوں کو ملی ہیں (جنتا دل کی ۲۸ سیٹ ہے) اس بار لوک سبھا کے دسویں الکشن میں کانگرس کو بہار میں صرف ایک سیٹ مل سکی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ یہاں کے مسلمانوں نے بڑے پیمانہ پر جنتا دل کو ووٹ دیا۔

ایک سیاسی مبصر جی ایس راج ہنس کا آرٹیکل ہندستان ٹائمس (۲۲ جولائی 1991) میں چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے —— بہار میں کانگرس کا اتنا برا حال کیوں ہوا :

(Why Congress did so badly in Bihar)

اس آرٹیکل میں کانگرس کی ہار کا ایک سبب یہ بتایا تھا کہ جنتا دل کے لیڈر اور چیف منسٹر لالو پرشاد یادو نے بڑی چالاکی سے مسلم کارڈ کھیلا۔ انھوں نے ایل کے اڈوانی کی رتھ یاترا بہار میں روک دی اس سے پہلے کہ وہ یوپی میں داخل ہو۔ اس طرح انھوں نے سارے ملک میں مسلمانوں کی احسان مندی حاصل کرلی۔ اس کے بدلے میں بہار کے مسلمان ایک طرف سے لالو پرساد اور ان کی پارٹی کی طرف چلے گئے جب کہ الکشن کا اعلان ہوا :

Mr Laloo Prasad Yadav played the Muslim card very deftly. He stopped Mr Advani's Rath Yatra in Bihar before it could enter UP and thus earned the gratitude of the Muslims all over the country. In turn, the Muslims of Bihar went all out for Mr Laloo Prasad Yadav and his party when the elections were announced.

رتھ یاترا کے روکنے یا نہ روکنے کا کچھ بھی تعلق مسلمانوں کے حقیقی مسائل سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر صرف ایک جذباتی مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "مسلم کارڈ" کا تصور ہی مسلمانوں کی بے شعوری کی زمین پر پیدا ہوا ہے۔ اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمان اگر اس معاملہ میں حساس ہو جائیں کہ ہمیں صد فی صد تعلیم یافتہ بننا ہے۔ ہم کو جدید صنعتوں میں آگے بڑھنا ہے۔ ہمیں اپنی ایک اعلیٰ صحافت پیدا کرنا ہے۔ اگر مسلمانوں کی حساسیت اس طرح کے امور میں ہو تو لیڈروں کے لئے یہ امکان ہی ختم ہو جائے گا کہ وہ الکشن کے موقع پر کوئی شعبدہ دکھا کر مسلم کارڈ کا کھیل کھیلیں۔ مسلم کارڈ صرف اس وقت ممکن

ہوتا ہے جب کہ قوم ظاہر فریب الفاظ پر خوش ہوتی ہو۔ حقیقی اور واقعی عمل پر خوش ہونے والے کبھی کسی کے ہاتھ میں اس قسم کا کارڈ نہیں بنتے۔

۲۷ جولائی کی شام کو پٹنہ کے اردو لائبریری ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اردو، ہندی، انگریزی اخبارات کے نمائندے موجود تھے۔ میں نے اپنے ابتدائی خطاب میں کہا کہ ہمارا مشن فکری بیداری (intellectual awakening) ہے۔ انڈیا ۱۹۴۷ میں آزاد ہو گیا۔ مگر تقریباً پچاس سال کے بعد بھی وہ اب تک ایک ترقی یافتہ ملک نہ بن سکا۔ یہاں کے مسائل گھٹنے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سیاسی آزادی تو حاصل کر لی گئی مگر افراد کے اندر تعمیر شعور کا کام بالکل نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں مختلف تفصیلات دیتے ہوئے میں نے کہا کہ ذہنی تعمیر کا کام مسلسل اور متواتر عمل چاہتا ہے۔ مگر اس نوعیت کی کوئی کوشش ہمارے یہاں ابھر نہ سکی۔ اخبارات یہ کام کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے اخبارات کا یہ حال ہے کہ تمام اخبارات کے اوپر سیاست جیسے موضوعات چھائے رہتے ہیں۔ تعمیری موضوعات کے لئے ان کے یہاں کوئی کالم نہیں۔

میرے ابتدائی خطاب کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا۔ بابری مسجد سے متعلق سوال کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس کا حل میرے نزدیک وہی ہے جس کو میں نے نہ صرف اپنے میگزین میں شائع کیا ہے بلکہ مشترکہ میٹنگوں میں پیش کیا ہے اور ہندستان ٹائمس وغیرہ میں بھی اس کو شائع کرایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مورخین کے ایک بورڈ کو بطور ثالث مقرر کیا جائے اور وہ جو فیصلہ کریں اس کو دونوں فریق بلا بحث مان لیں۔

اگلے دن صبح کو مقامی اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات میں اس پریس کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوئی۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۸ جولائی) نے اپنی رپورٹ کی سرخی میں بورڈ والی تجویز کو نمایاں کیا اور ان الفاظ میں اس کی سرخی قائم کی:

(Historians should resolve Ayodhya issue)

ہندستان ٹائمس (۲۸ جولائی) نے دوسری باتوں کے علاوہ اس تنقید کا بھی ذکر کیا جس کی زد خود اس کے اپنے اوپر بھی پڑتی تھی۔ اس نے لکھا کہ مولانا نے اخباروں سے اپیل کی کہ وہ انسانی دلچسپی کے واقعات کو نمایاں کریں اور ان کو نصیحت کی کہ وہ صرف سیاست میں گم ہو کر نہ رہ جائیں:

The Maulana called upon the media to highlight human-interest stories and exorted it not to remain obsessed only with politics

۲۸ جولائی کو ڈاکٹر عبد الحیٔ کمرشیل کامپلکس میں درس قرآن کا پروگرام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جدید طرز پر ایک وسیع بلڈنگ بنائی ہے جو کئی منزلہ ہے۔ اس کی تیسری منزل پہ ایک خوبصورت مسجد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ عمل ایک نمونہ ہے جو بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ فارسی شاعر نے کہا تھا:

خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح　　　　در عمارت گریٔ گنبد اسلاف خود اند

مگر ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب نے اپنا گنبد بنانے کے ساتھ خانۂ شرع بنانے کی نہایت عمدہ مثال قائم کی ہے۔ اس مسجد میں ہفتہ وار درس کا باقاعدہ نظام قائم ہے۔ میں نے اپنے درس میں قرآن کی اہمیت اور عظمت پر کچھ باتیں عرض کیں۔ اس کا ٹیپ ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔ دوسرے تمام پروگراموں کا بھی ٹیپ لیا جاتا رہا۔

۲۸ جولائی کی شام کو ایک پروگرام سنہا انسٹی ٹیوٹ (اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز) میں رکھا گیا تھا۔ یہ اجتماع ڈاکٹر ڈی ڈی گرو کی صدارت میں ہوا۔ اس کا عنوان تھا: اسلام اور بقاء باہم (Islam and co-existence) اجتماع میں تقریباً ۵۰ فیصد ہندو اور ۵۰ فیصد مسلمان تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انسانوں کے درمیان پرامن باہمی بقا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ ان کے پاس عمل کے لئے پرامن طریق کار ہو۔ اس کے بعد میں نے بتایا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام قوموں میں اپنے عمل کے لئے صرف تشدد دانہ طریقہ (وائلنٹ میتھڈ) کا رواج تھا۔ پیغمبر اسلام نے تاریخ میں پہلی بار غیر تشدد دانہ طریقہ (نان وائلنٹ میتھڈ) لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اس پر عمل کر کے دکھایا کہ پرتشدد طریق کار کے مقابلہ میں بے تشدد طریق کار زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد ہے۔ اس سلسلہ میں سیرت کی بہت سی مثالیں پیش کیں۔ آخر میں سوال و جواب ہوا اور صدر کی اختتامی تقریر پر کارروائی ختم ہوئی۔

۲۸ جولائی کی شام کو ڈاکٹر عبد الحیٔ کمرشیل کامپلکس کے ہال میں دوبارہ ایک پروگرام ہوا۔

اس کا عنوان تھا " اسلام اور عصری چیلنج "۔ مسٹر ایل ڈیال آئی اے ایس (سابق چیف سکریٹری) نے صدارت کی۔ اور جناب محمد شفیع قریشی گورنر بہار نے خصوصی مہمان کے طور پر شرکت کی۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جدید سائنس اور جدید علوم کی بنیاد پر اسلام کے لئے جو فکری چیلنج پیدا ہوا وہ اسلام کے لئے کوئی مخالف انقلاب نہ تھا بلکہ ایک مددگار انقلاب تھا۔ مگر جس طرح برسات کے ساتھ کیچڑ آتی ہے۔ اسی طرح اس مفید انقلاب کے ساتھ کچھ ناخوش گوار باتیں بھی شامل تھیں۔ مگر مسلم دانشور اور رہنما اس کے ناخوش گوار پہلوؤں میں الجھ کر رہ گئے، وہ اس کے مفید پہلو کو اسلام کے حق میں استعمال نہ کر سکے۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ اس کو واضح کیا۔

۲۹ جولائی کی صبح کو ایوب گرلز کالج میں خواتین اور طالبات سے خطاب کا پروگرام تھا۔ اس کا عنوان تھا " اسلام اور خواتین " میں نے سادہ انداز میں بتایا کہ اسلام نے عورت کو کتنا زیادہ عزت اور احترام کا مقام دیا ہے۔ اور یہ کہ اسلام کے دائرہ میں رہ کر عورت انتہائی بڑے بڑے کام کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے حضرت ہاجرہ کی مثال تفصیل کے ساتھ پیش کی اور کہا کہ کسی شخص کا یہ قول سب سے زیادہ جس خاتون پر صادق آتا ہے وہ حضرت ہاجرہ ہیں:

There is a woman at the beginning of all great things.

ایوب گرلز کالج کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کے منتظمین کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ وہ لوگ غریب خاندان کی لڑکیوں کو خصوصی طور پر اپنے یہاں داخلہ دیتے ہیں اور ان کی ہر طرح مدد کرتے ہیں تاکہ وہ تعلیم یافتہ ہو کر اپنے خاندان کے معیار کو بلند کر سکیں۔ چنانچہ اس کالج میں تقریباً ۵۰ فیصد طالبات غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

پٹنہ میں مجموعی طور پر چھ تقریری پروگرام ہوئے۔ ہر پروگرام میں امید سے زیادہ تعلیم یافتہ افراد نے شرکت کی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ پٹنہ میں الرسالہ کی دعوت اللہ کے فضل سے کافی پھیل چکی ہے۔ قومی اشو اور " اسلام خطرہ میں " جیسے نعروں پر بھیڑ جمع کرنا بہت آسان ہے۔ مگر راقم الحروف کے پروگراموں میں جو لوگ جمع ہوئے وہ الرسالہ کے تعمیری مشن کے نام پر جمع ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کی آواز اب لوگوں کے درمیان بذات خود ایک موثر اور قابل لحاظ آواز بن چکی ہے۔

مسٹر ایم ٹی خان (کنوینر) نے کہا کہ ۱۹۸۶ میں جب ہم لوگوں نے آپ کو پٹنہ بلایا تھا، وہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے ہم نے کئی سبق لئے۔ چنانچہ موجودہ سفر میں ہم نے تین نئے پروگرام رکھے۔ ایک پریس کانفرنس۔ دوسرے غیر قارئین الرسالہ سے اپروچ کرنا، مسلم اور غیر مسلم دونوں سے۔ ہم نے انھیں ہندی، انگریزی اور اردو الرسالہ دے کر آبزرور کی حیثیت سے سمپوزیم میں آنے کی دعوت دی۔ تیسرا پروگرام عورتوں میں خطاب کا انتظام تھا۔ دعوت نامہ کو بھی انھوں نے تعارف کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ اس موقع پر جو دعوت نامہ چھاپا گیا اس کی پشت پر الرسالہ مشن کے سات اہم نکات لکھے ہوئے تھے۔ ایک یہ تھا:

> One's faith in religion should be the outcome of a self-conscious enquiry. Such faith would be reasoned not conditioned, insighted not inherited, rational not traditional.

مذکورہ اجتماعات میں کچھ سوالات کیے گئے جن کا جواب دیا گیا۔ میری قیام گاہ پر بھی پٹنہ اور پٹنہ کے باہر کے افراد برابر آتے رہے۔ ان سے سوال وجواب کی صورت میں گفتگو جاری رہی۔ ان سب کو سمپوزیم کے سوال وجواب کے ساتھ یکجا طور پر درج کیا جارہا ہے۔

تاہم خواہ سوال وجواب کا معاملہ ہو یا تقریر کا معاملہ، ان کی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ سامع ایک تیار ذہن (prepared mind) کی حیثیت رکھتا ہو۔ اگر سامع کا ذہن تیار نہ ہو تو بولنے والے اور سننے والے کے درمیان ایک فکری بعد (intellectual gap) پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں فکری بُعد پایا جائے وہاں کسی کو کچھ سمجھانا انتہائی مشکل ہے (لقمان ۷)

مثلاً اگر کوئی شخص فخر کی نفسیات میں جی رہا ہو تو تواضع کی بات اس کے لئے قابل فہم نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص ظلم کی اصطلاحوں میں سوچنے کا عادی بن گیا ہو تو چیلنج کی اصطلاح میں سوچنا اس کے لئے سخت دشوار ہوگا۔ کوئی شخص اپنے بڑوں کو تنقید سے بالاتر سمجھ لے تو وہ اس پر راضی نہیں ہو سکتا کہ اپنے بڑوں کے کسی اقدام کو غلط ٹھہرائے۔ جہاں متکلم اور سامع کے درمیان اس قسم کا فرق ہو وہاں متکلم کی بات سامع کے لئے اجنبی بن جائے گی۔ اس کے لئے متکلم کی بات کو سمجھنا اسی طرح ناممکن ہو جائے گا جس طرح ایک اردو داں کے لئے روسی یا جاپانی کلام کو سمجھنا۔

نئی دہلی کے ایک ادارہ (Citizens' Drive) کے تحت یکم جون ۱۹۹۱ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک راؤنڈ ٹیبل میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع بحث تھا :

Growing cult of violence in Indian politics.

صدر اسلامی مرکز کو اس اجتماع میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ اس میں شریک ہوئے اور مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔

۲ بعض مقامات پر الرسالہ کے قارئین نے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ یعنی "الرسالہ سمپوزیم" منعقد کرنا۔ ضرورت ہے کہ اس انداز پر ہر جگہ سمپوزیم کئے جائیں۔ ان میں موافق اور مخالف ہر ایک کو بولنے کا موقع دیا جائے اور الرسالہ کے پیغام کے ہر پہلو پر کھلا اظہار خیال کیا جائے۔ آخر میں حلقۂ الرسالہ کا کوئی ذمہ دار شخص اپنی آخری تقریر میں اپنی رائے دے اور بحث کی تکمیل کرے۔

۳ ڈاکٹر انوار الحق صاحب (اعظم گڈھ) کئی سال سے الرسالہ اور اس کی مطبوعات کو ایک مہم کے طور پر اپنے علاقہ میں پھیلا رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے حلقہ میں پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اب الرسالہ کی آواز ہی سب سے زیادہ طاقت ور آواز بن رہی ہے اور مخالفین اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کرنے لگے ہیں۔

۴ ایک صاحب لکھتے ہیں : آپ کے خلاف جو ساڑھے تین سو صفحہ کی کتاب چھپی ہے اس کا میں نے بغور مطالعہ کیا۔ بہت افسوس ہوا کہ مصنف نے آپ کے خلاف نہایت نازیبا اور نامعقول انداز استعمال کیا ہے۔ ان کے اعتراضات محض برائے اعتراض ہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے تخریب اور انتشار کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کی مقبولیت اور آپ کے دائرہ کی مسلسل وسعت ان سے برداشت نہیں ہو پائی ہو۔ مجھ جیسے آدمی نے بھی یہ سمجھ لیا کہ جگہ جگہ انھوں نے اعتراض کرنے میں کیسی شدید غلطی کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ الرسالہ اور آپ کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کرکے ہماری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ اسلام اور دین الٰہی کیا ہے۔ آج ہماری نماز، ہمارا روزہ، ہماری زکوٰۃ اور تلاوت قرآن وغیرہ بالکل مختلف ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ شاید یہی وہ طریقہ ہے جو بارگاہ رب العالمین میں پسندیدہ ہوگا (اقبال احمد، مراد آباد)

۶ محمد نعیم صاحب (گنگاپور ، راجستھان) الرسالہ ہندی اور الرسالہ اردو کی ایجنسی چلاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جن لوگوں کو الرسالہ دیتے ہیں ان میں سے ایک سیتا رام آریہ بھی ہیں۔ وہ ہندی روزنامہ "پرجاجن" کے ایڈیٹر ہیں۔ اور الرسالہ ہندی بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے بعض مضامین اپنے اخبار میں نقل کرتے ہیں۔

۷ اسلامی مرکز کے تحت جو مختلف دعوتی اور تعمیری کام ہو رہے ہیں، ان کو جاری رکھنے کے لئے نیز اس میں اضافہ اور ترقی کے لئے ضرورت ہے کہ لوگوں کا مالی تعاون ہمیں حاصل رہے۔ خاص طور پر الرسالہ کی مد میں آپ کا تعاون بے حد ضروری ہے۔ تاکہ اس کی قیمت میں اضافہ کئے بغیر اس کو جاری رکھا جاسکے۔

۸ محمد مطلوب صاحب (رامپور) الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے الرسالہ کے پیغام کو عملی تجربہ میں نہایت مفید پایا ہے۔ جب جب میں نے الرسالہ کی تعلیم کے مطابق مثبت انداز اختیار کیا تو مجھے زبردست فائدہ ملا۔ اور جب کبھی میں نے منفی طریقہ اختیار کیا تو مجھے نقصان اٹھانا پڑا۔

۹ مولانا سعید صاحب (سورت) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہر ہفتہ جمعہ کی نماز سے پہلے الرسالہ کے مضامین کو سناتے ہیں اور اس کی تشریح کرتے ہیں۔ اس طرح بہت سی مسجدوں کے امام جمعہ کے دن الرسالہ کی باتوں کو اپنی تقریروں میں بیان کرتے ہیں۔

۱۰ خلیج ڈائری (الرسالہ مئی ۱۹۹۱) کو مختلف اخبارات نے قسط وار نقل کیا ہے۔ مثلاً سرینگر کا چٹان (مئی ۱۹۹۱) اسی طرح پاکستان کے روزنامہ وفاق نے اپنے شمارہ ۲۴ اپریل اور ۲۵ اپریل ۱۹۹۱ میں مکمل طور پر نقل کیا ہے۔ وغیرہ۔

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں : خلیج ڈائری پڑھی۔ اس کا ہر صفحہ عبرت اور نصیحت کا کوہ ہمالہ ہے۔ میں نے بمبئی کے بک اسٹالوں کا سروے کیا، تمام بک اسٹالوں پر الرسالہ ختم ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے پرانے رسالے بک اسٹال پر مل جاتے تھے، اب ہر جگہ الرسالہ ہاتھوں ہاتھ ہدیہ ہو رہا ہے (محمد افضل لاد ی والا ، بمبئی)

۱۲ ایک صاحب لکھتے ہیں : "خلیج ڈائری" سات عدد موصول ہوئی۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ میں اپنے جمعہ کے خطبات میں الرسالہ کے اقتباسات برابر سناتا ہوں۔ سامعین الرسالہ

کی باتوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر لوگوں کو بطور مطالعہ بھی دے رہا ہوں
(قاضی محمد ادریسی، شاہ جہاں پور)

۱۳ ایک صاحب لکھتے ہیں : میں تقریباً چار سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کے تمام مضامین ٹو دی پوائنٹ اور دل کو چھونے والے ہوتے ہیں۔ جب سے میں نے الرسالہ پڑھنا شروع کیا ہے تب سے میری زندگی میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ میرا ذہن صاف اور میرا نظریہ بہتر ہونے لگا ہے۔ آپ کی کتاب "راہ عمل" دیکھی۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کو دوسروں سے شکایت کرنے کے بجائے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی طرف دھیان دینا چاہئے۔ مجھے ہر مہینہ الرسالہ (اردو، انگریزی) کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ (نثار احمد خاں کشمیری، بمبئی)

۱۴ مسٹر ششی منڈن (آگرہ) لکھتے ہیں : دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی غرض سے بہت سے جرائد و رسائل ملک میں نکل رہے ہیں۔ لیکن الرسالہ کا اپنا منفرد مقام ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کر چکے ہیں، لہٰذا آپ کا مشاہدہ و مطالعہ بہت وسیع ہے۔ جون کے شمارہ میں "قومی مسئلہ" کے عنوان سے آپ نے ملک کے مختلف حصوں میں چل رہی علیحدگی پسند پر تشدد تحریکوں پر قلم اٹھایا۔ آپ نے بیباک انداز میں حقیقت کو قارئین کے سامنے رکھ دیا۔ الرسالہ کے ذریعہ مذہب اسلام کے متعلق جس قدر معلوم ہوا اتنا شاید دوسرے رسائل و جرائد سے ممکن نہیں ہے۔ الرسالہ کی تحریروں سے اسلام کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ اسے مجھ جیسے غیر مسلم حضرات بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ آپ کی تحریریں جذبات کے بجائے حقیقت کو قارئین کے سامنے لاتی ہیں۔ ان سے اسلام کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ الرسالہ اسلام کے سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوا ہے۔

۱۵ الرسالہ کے مضامین کو لوگ مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بنگلور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے لوگوں نے انگریزی الرسالہ میں پڑھا :

A thousand mile journey starts with the first step.

اس کو انھوں نے ہاتھ سے یا کمپیوٹر سے لکھ کر اپنے دروازوں پر لگا دیا اور دوسروں تک پھیلایا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے (ہوائی ڈاک)		(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ 〃 〃	۱۸ 〃 〃
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ 〃 〃	۲۵ 〃 〃
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ 〃 〃	۴۰ 〃 〃
خصوصی تعاون (سالانہ)	۲۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ 〃	— —

ڈاکٹر ثنا ئی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

RNI 28822/76 □ Octoberr 1991 No. 179 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" " جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	55/-
صراط مستقیم	35/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہ عمل	25/-
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	15/-
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	30/
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیات طیبہ	5.
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنت رسول	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-
इन्सान! अपने आपका पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-
पैग़म्बरे-इस्लाम	3/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

U(SE)12/86